تاریخ تالیف

لمولفه

این جلوهٔ معنی که بقرطاس پدید است ‎ ‎ ‎ مهر است عجم را و عرب را مہ عید است

نزدیکِ خدایانِ سخن بسکہ رسیده ‎ ‎ ‎ شیرازهٔ مجموعہ من حبلِ ورید است

از گنجِ نعم مژده دہد بیخبران را ‎ ‎ ‎ این نظمِ گہرریز کہ آواز نشید است

نازم کہ حیاتِ ابدی یافتہ امروز ‎ ‎ ‎ در مقتلِ عشاق ہر آنکس کہ شہید است

سالِ رقمش ناصری از کلکِ گہربار ‎ ‎ ‎ بنوشت کہ آثار صنادید پدید است

سنہ ۱۳۴۲ھ

بے حشو ز عرفی شمر این سال رقم را
آثار پدید است صنادید عجم را

سنہ ۱۳۴۲ھ

۱۳ ۱۴ +

فہرست مضامین

باب اول

آثارِ شکستہ

تمہید

اُمّ البلاد کی قومیں جب دنیا کو آباد کرنے نکلیں تو وہی شرافت پناہ فرقہ جو ایریا کہلاتا ہے بام دُنیا سے آترا اور مختلف ممالک کی زینت ہوا۔ نگارخانۂ چین۔ حکمت یونان۔ قانونِ روم اسی کی بیش بہا یادگاریں ہیں اور وید اور ژند و پاژند اسی کے کارنامے۔ اندلس کی زمین سے چاندی نکالنا اسی فرقے کا کام تھا اور ایران میں درفش کاویانی کی ترصیع میں اسی کا نام تھا۔ فلسفۂ لغت کے ماہرین کہتے ہیں کہ ایران (مُلک کا نام) بھی اسی قوم کے نام سے مشتق ہوا اور شاید یونان کی کتب قدیمہ میں اسی کو آریان لکھا ہے۔

آثار قدیم

بہرتقدیر سرزمینِ ایران ابتداے آفرینش سے جنّت نشان ہے۔ ملک کی شادابی۔ زبان کی شیرینی۔ تخییل کی نزاکت۔ ذہن کی جودت یہاں کے رہنے والوں کو فطرت کی طرف سے عطا ہوئی ہیں۔ ان خصوصیات پر اگر لحاظ رکھا جاے تو اس ملک کو کسی زمانے میں بھی انشاپردازی سے خالی سمجھنا ذرا مشکل ہوجاے گا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی بادِ مخالف کے تند جھونکوں نے یہاں کی نظم و نثر کے اوراق منتشر کردیے ہوں یا کسی جہاں سوز جنگ نے ان کے علوم کے خزانے جلادیے ہوں لیکن کرمان شاہ کے ویرانے

ذیل میں چند امور شمار کئے جاتے ہیں :۔

(۱) مہ آبادیوں کے زمانے میں چار برن تھے۔کاتوزی[۱] یعنے زہدان گوشہ نشین۔نیساری[۲] یعنے افسران ملک و فوج۔نسودی[۳] سختی نہ برداشت کرنے والے اور الوہشی[۴] سختی برداشت کرنیوالے۔ پیشدادیوں نے ترمیم کی اور چار گروہ یوں قائم کئے۔آسورنی[۱] علمائے ملت۔آرتنشتار[۲] سلاطین وسپاہ۔استرہوش[۳] کاشتکار۔ہوتخش[۴] مزدور وغیرہ۔

(۲) جانوروں کا مارنا گناہ عظیم تھا۔

(۳) تناسخ پر اعتقاد جزو مذہب تھا۔

(۴) صبح۔دوپہر۔شام اور آدھی رات کو عبادت کی جاتی تھی۔ان کی گیتا کا نام گاتھا اور منتر کا نام منتھرا تھا۔

(۵) خدائی کارکن جنھیں ہندو لوگ دیوتا کہتے ہیں ان کے یہاں فرشتہ کہلاتے تھے اور آگ۔پانی۔ہوا۔بجلی۔بہار۔حسن۔عشق غرض ہر چیز کا ایک دیوتا یا فرشتہ مانا جاتا تھا۔زرتشت نے اس اعتقاد کو بالآخر مٹا دیا۔

(۶) اجرام سماوی کی مورتیں بنائی گئی تھیں اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔افسانہ گو اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے :۔

بدو گفت سہراب کاے خوب چہر به تاج و به تخت به ماه و به مهر
که این باره با خاک پست آورم ترا اے ستمگر بدست آورم

(۷) قربانی۔جنیو۔ہون وغیرہ کا بھی پتا لگتا ہے۔

(۸) گائے کی تعظیم بھی کی جاتی تھی اور جب سے فریدوں کی

اور آگ کے دیوتا کی تعظیم ہوتی تھی۔ جون کے مہینے میں آب ریزان
ہوتا تھا جسمیں ایک دوسرے پر رنگ ڈالتے تھے۔ اعتدال خریفی کا جشن
ستمبر میں ہوتا تھا اور اعتدال ربیعی میں نوروز اور خرم روزان کے
مشہور جشن تھے جنکی مثالیں ہندوستان میں بھی ملینگی۔

مقدس کتابیں

یہ مذہبی رسوم جو تحریر ہوئے ہیں بادی النظر میں معلوم ہوتے
ہیں کہ کچھ تو آبادیوں اور پیشدادیوں کے وقت سے چلے آتے تھے
اور کچھ زرتشت کے بعد جاری ہوئے۔ افسوس ہے کہ دین زرتشتی
سے پہلے کی کتابیں موجود نہیں اور نہ سردست کوئی ذریعۂ
تحقیق موجود ہے ورنہ اس قوم کے ارتقائے مذہبی کی تاریخ
مسلسل لکھی جاتی۔ لیکن جہانتک اندازہ ہوسکا ہے یہ معلوم ہوتا ہے
کہ زرتشت کی حیثیت اس تاریخ میں وہی ہے جو گوتم بدھ
کی ہندوستان میں تھی۔ گشتاسب اور اسفندیار جو کیانیان
دوم کے ابتدائی سلاطین میں تھے زرتشت کے فروغ کے باعث
ہوئے جسکی تعلیم و تلقین قدیم عجائب پرستی کی مخالف تھی اور آتش
پرستی کے پردے میں ایک نئی روشنی پھیلا رہی تھی۔ اس مُصلح دین
وملت کی مقدس کتاب کا نام ژند[1] تھا مگر یہ کتاب نہایت مشکل
تھی اس لئے شرح لکھی گئی اور اس کا نام پاژند[2] رکھا گیا تاکہ
بقول مولانا آزاد "جب ژند پاژند سے ٹکرائے تو جلوۂ حق روشن
نظر آئے"۔ مگر شرح متن سے مشکل ہوگئی لہذا اس کی ایک تفسیر

---

[1] لفظی معنی چقماق کا وہ جزو جو آگ نکالتا ہے۔

[2] چقماق کا دوسرا جزو۔

خردہمنداروند اسپ ہمت وہیخت وہورشت
خرومند قوی اسپ بہ نیک نیت نیک گفتار و نیک کردار نماز برائے

دساتیر کا اقتباس:-

ہوزامیم فہ مزدان ہزہزماس وزماس ہرشیور
پناہم بہ یزدان از منش و خوی بد درشت گمراہ کنندہ

ہردبور فہ شید شمستاے ہرشندہ ہرشنگر زمریان
و براہ بد برندہ بنام ایزد بخشائندہ بخشائشگر مہربان

فروہید ور-
داد گر

دیکھنا! اس عجیب اتفاق کو کہ یہ آخری دو فقرے اپنے معانی میں اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کس قدر مشابہ ہیں۔

علمی کمال

ان کتابوں کے ترجمے انگریزی وغیرہ میں ہو گئے ہیں جنکے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حقائق و معارف۔ حکمت اخلاق و سیاست مدن وغیرہ کے ذخیرے ان قوموں کے پاس نہایت عمدہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام نے ایران کے کمالات کو معراج پر پہونچا دیا اور اپنے علوم و فنون سے اس ملک کو اتنا متاثر کیا کہ بعدِ اسلام کے تصانیف۔ اصطلاحات و خیالات وغیرہ میں عرب کے زلہ ربا معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو پرانی فارسی میں منطق و فلسفہ و فقہ و ادب وغیرہ کے مصطلحات خالص فارسی میں ملتے ہیں اور

قسم کھاتا تھا تو لوگ اُس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے تھے آئین مہ آبادی میں تاکید تھی کہ رعایا کو آرام سے رکھنا بادشاہ کا فرض ہے ۔ وزیر سب سے بڑا مہندس اور حکیم ہوا کرتا تھا اور تمام عمّال سرکاری اُسکے ماتحت ہوتے تھے ۔ خاص ماتحتوں میں دو استوار (امین) دو شدہ بند (وقائع نویس) ہوتے تھے جو منصب وزارت کے مخصوص معین تھے ۔ خبر رساں لوگ رَدَند کہلاتے تھے ۔ فوج میں ایک لاکھ پر سپہبد ۔ اُن سے نیچے کئی سہ ہزار کے سردار ۔ پھر سو سو پر سپہدار پھر دس دس پر سالار پھر چار چار، پانچ پانچ کے افسر ۔ ہر شہر میں فرہنگ روز (کوتوال) ہوتا تھا جو سراغ رسانی اور واقعہ نگاری کے فرائض کا نگراں تھا ۔ مالگذاری مہ آبادیوں کے زمانے میں بیسواں حصہ آمدنی کا تھی لیکن ساسانیوں کے زمانے میں دہ یک کا سلسلہ قائم ہوا ۔ فوجداری اور دیوانی کے محکموں کے افسر فرہنگ دار اور دادستاں تھے یعنے قاضی و مفتی ۔ آئین مہ آباد کے فتوے بغیر بادشاہ کو بھی قتل کا اختیار نہ تھا ۔ سوداگر اور مسافر اگر فلاکت میں مبتلا ہو جاتے تھے تو سلطنت کی طرف سے اُن کی مدد کی جاتی تھی ۔ بیمار ۔ اپاہج ۔ بیمارخانوں میں داخل کئے جاتے تھے ۔ سراؤں کی تعمیر اور سڑکوں کی درستی پر پوری تاکید رہتی تھی ۔ حرم سراؤں کے بھی آداب و قواعد مقرر تھے ۔ مختصر یہ کہ ہر حیثیت سے ایک نظم اور ضابطہ کا پتہ لگتا ہے ۔ جن سے اسلاف عجم کی عظمت ظاہر ہوتی ہے ۔

موسمی حالت کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا لازم ہے کیونکہ موسمی حالات

زمانہ ہے۔ ہندی شاعر نوروز کا حال نظم کرتے وقت پانی برسنے کا نظارہ پیش کرتا ہے جو واقعیت کے سراسر خلاف ہے۔ خاقانی کو دیکھو کس مزے سے کہہ گیا ہے :۔

نوروز برقع از رخ زیبا برافگند بر گستوان بہ دُلدُلِ شہبا برافگند

یہ برقع کیا ہے۔ وہی برف کی چادر ہے جو ہر خوبصورت چیز کے چہرے سے ہٹ گئی ہے۔ یا مثلاً نظامی نے کہا ہے :۔

دہن ناکشادہ لب آبگیر کہ آید لبِ غنچہ را بوے شیر

یعنے ابھی حوضوں کے کنارے کی برف اچھی طرح نکل کر بہ نہیں چکی مگر غنچہ کو اپنی پرورش کے لئے پانی ملنے کی امید پیدا ہو گئی ہے۔

تابستان کی ابتدا ۲۳۔ جون سے ہے۔ دریاؤں میں پانی زور شور سے بہتا ہے۔ میوے تیار ہیں۔ گرمی پڑنے لگی ہے۔ ناشپاتیاں۔ سیب۔ انگور اس کثرت سے ہیں کہ جانور تک ان سے سیر ہو جاتے ہیں۔ کاروبار تجارت بخوبی چلنے لگتے ہیں۔ یہیں سے گرم بازاری یا سرد بازاری سمجھ میں آتی ہے کہ کیا چیز ہے اور یہ محاورات کیوں قائم ہوئے۔ پھر گرمی ہنگامہ۔ گرمی صحبت۔ شعر گرم۔ حسن گرم۔ گرمی گفتار وغیرہ کو دیکھو اور قیاس کرو کہ کیا لطف کا زمانہ ہو گا۔ ہندوستان والا گرمی سے پناہ مانگتا ہے جب تک ایران نہ جائے کیا سمجھے؟

پائیز ۲۳۔ ستمبر سے شروع ہوتا ہے۔ برف باری کا آغاز سرد بازاری کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ کسانوں نے بیج بو دئے۔ اوپر سے برف گری اور زمین ڈھک گئی۔ فردوسی نے

وغیرہ) سے منسوب ہیں۔ یہیں انکی نشو و نما ہوئی ہوگی اور یہیں خاتمہ۔ ممکن ہے کہ اب بھی ان ممالک کے محاورات وفقرات میں کوئی خصوصیت باقی ہو جس میں ان مردہ زبانوں کا اثر موجود ہو۔ لیکن کوئی تصنیف یا کتابہ موجود نہ ہونے کی وجہ سے سردست ان کے متعلق کوئی تحقیقی بات نہیں کہی جاسکتی البتہ فارسی۔ دری اور پہلوی کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے۔

دری

دری۔ کہا گیا ہے کہ کسی زمانے میں دربار کی زبان تھی۔ اب قہستان میں اسکے نشان پائے جاتے ہیں۔ اہل یورپ کے تحقیقات کے نتائج سے جو استنباط کیا جاسکتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ غالباً یہ قدیم فارسی ہے جس میں غیر زبانوں کے الفاظ ومحاورات داخل نہیں ہیں۔ کیکاؤس وکیخسرو وغیرہ اسی کو بولتے تھے اور نقش رستم اور خرابات استخر کے کتبے اسی زباں میں ہیں۔

پہلوی

پہلوی۔ کہتے ہیں کہ یہ زرتشت کی زبان ہے اور ادستا وغیرہ اسی زبان میں تصنیف ہوئی ہیں۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ محض اس رسم کتابت کا نام ہے جو ارامی اور اشوری قوموں سے حاصل کی گئی تھی۔ اس رسم الخط میں مثلاً "بادشاہ" کے لئے ایک صورت خاص وضع کی گئی تھی اگر یہ صورت تحریر میں ارامی وسریانی وغیرہ میں آتی تھی تو اس کا تلفظ "ملک" کیا جاتا تھا اور اور اگر فارسی میں آتی تھی تو "شاہ" ہوتا تھا۔ یہ فرق صرف اسلاف کو معلوم تھا۔ اخلاف کے زمانے میں انکے فارسی تلفظ مفقود ہو گئے اور ارامی واشوری وسریانی وغیرہ کے تلفظ داخل ہو گئے۔ نتیجہ

وغیرہ ابتدا میں کیا تھیں اور غیر قوموں اور فاتحوں کے اثر سے
ان میں ارتقائے تدریجی ہوتے ہوتے کیونکر "اردو" زبان قائم
ہو گئی۔ انگلستان کی تاریخ سے اندازہ ہوگا کہ انگلیس اور سیکسن
زبانیں کیا تھیں۔ پھر یونان۔ ڈنمارک۔ اندلس۔ لاطن۔ فرانسہ
اور جرمن کے اثر سے موجودہ انگریزی زبان کیونکر قائم ہوئی۔
فی الحقیقت اس تالیف کا منشا یہی ہے کہ اسی زبان کے انشا کے
خصوصیات اور انشا پردازوں کے حالات قلمبند کئے جائیں۔
لیکن اخلاف کے کمالات کا سلسلۂ تاریخی قائم کرنے کے لئے
اسلاف کے حالات وخصوصیات کا علم لابدی ہے کیونکہ اساسِ
لغت وانشا وہی مٹا ہوا نقش ہے لہذا اس مقام پر اختصار
کیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ آئندہ ہر ایک دور کے سلسلے میں اس
ارتقائے تدریجی کا ذکر آئیگا۔

قدیم شعر و شاعری

اس باب کے ختم کرنے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ
اسلاف کی نظم کا بھی ذکر کیا جائے کیونکہ پرانی قوموں میں شعر کا وجودِ
مستقل تاریخی دنیا میں نثر سے پیشتر دکھائی دیتا ہے مگر نہایت
افسوس سے معذرت کی جاتی ہے کہ کوئی شعر اس وقت تک
ایسا دستیاب نہیں ہوا جو اس زمانے سے منسوب ہو سکے۔
البتہ پارسیوں کی بعض دعائیں نظم میں ہیں بلکہ بعض کتب میں کچھ
منظومات بھی درج ہیں لیکن ہمارے تذکرہ نویس صرف اتنا لکھتے
ہیں کہ پہلا مصرعہ بہرام چوبیں کا ہے جس نے شیر مار کے فخریہ
کہا تھا:۔

لیکن تاریخ ادب سمجھنے کے لئے اس کا علم ضرور چاہیے کیونکہ اکثر محاورات والفاظ۔ بیشتر تلمیحات و تشبیہات انھیں افسانوں سے وابستہ ہیں۔ بلکہ قومی خیالات اور رواسم وغیرہ پران کا اچھا خاصہ اثر ہے۔ وما ھٰذا اِلّا اساطیرالاوّلین۔

——>•>•※•<•<——
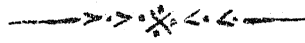
تخت نشین ہوا۔

ہوشنگ — یہ وہی **ہوشنگ** ہے جس کا نام تاریخ عرب میں اوشہنج ہے۔ اس کی چہل سالہ سلطنت میں آگ کا چقماق سے نکالنا معلوم ہوا اور پارسیوں کا **جشنِ سدہ** اسی اکتشاف کی یادگار ہے۔

طمورثا — **تہمورس** (طمورث) دیوبند اپنے باپ ہوشنگ کے بعد وارث سلطنت ہوا۔ لقب خود بتاتا ہے کہ جنوں اور دیوؤں پر غالب آگیا تھا مگر مغلوب قوموں کی جان بخشی اس شرط پر کردی تھی کہ مختلف زبانیں اور خط و کتابت سکھادیں۔ چنانچہ افسانہ نگار کہتے ہیں کہ یہ بادشاہ تیس زبانیں جاننے لگا اور تیس ہی سال سلطنت کرکے دنیا سے گذر گیا۔

جمشید — جمشید اسی پڑھے لکھے باپ کا بیٹا تھا جو قصص و روایات میں قدیم عظمت و سطوت کا مرکز بن گیا ہے اسکا پایۂ تخت استخر تھا جسے تختِ جمشید بھی کہتے ہیں۔ جن۔ دیو۔ پری۔ ابر ہوا۔ غرض کائنات پر تسلّط تھا۔ اور تخت شاہی ہوا میں اڑتا تھا اسی وجہ سے عرب اسے سلیمانؑ بن داؤدؑ سمجھتے ہیں حالانکہ ابن المقفع ان "جاہل عربوں" کا مضحکہ اڑاتا ہے کہ جمشید و سلیمان کے درمیان کم سے کم تین ہزار برس کا فاصلہ تھا۔ بھلا یہ دونوں ایک کیونکر ہوسکتے ہیں۔ ہندوؤں کا یام یہی جم سمجھا گیا ہے کیونکہ شید محض نام پر اضافہ ہے

میں اس کا تلفظ عربی کر دیا گیا تاکہ یہ قدیم ایرانیوں کا دشمن بھی اُسی قوم عرب میں شمار ہونے لگے جو آخر عہد میں سلطنت ایران سے برابر نبرد آزمائی کیا کرتے تھے اور بالآخر آل ساسان کے زوال کے باعث ہوئے ضحاک نہایت ظالم بادشاہ سمجھا گیا ہے اور ظلم کا نتیجہ یوں نکلا کہ دو سانپ اسکے شانوں پر ظاہر ہوئے جن کی غذا کے لئے دو آدمیوں کے بھیجے روزانہ آتے تھے۔ ہزار برس کی سلطنت میں اس بادشاہ نے اتنے ظلم و ستم کئے کہ سارا ایران گھبرا گیا۔ کیانیوں سے اس قدر عداوت تھی کہ واجب القتل ہونے کے لئے اس خاندان سے انتساب کافی تھا۔ ایک کیانی بی بی حالت حمل میں جان بچا کے بھاگی اور پہاڑوں میں رہنے لگی۔ وہاں بچہ پیدا ہوا جس کا نام فریدوں رکھا۔ ماں کا دودھ سوکھ گیا اور بچہ مصیبت میں گرفتار ہوا خدا کی رحمت سے ایک گائے آئی جس کا نام مایہ یا مایون یا برمایون بتایا گیا ہے۔ اسکے دودھ سے فریدوں کی پرورش ہوئی۔

فریدوں

یکے گاؤ برمایہ خواہد بدن — جہاندار را دایہ خواہد بدن

ضحاک کو نجومیوں نے بتلایا کہ تیرا دشمن پیدا ہوا ہے اور فلاں پہاڑ میں پرورش پا رہا ہے۔ ظالم بادشاہ لشکر لیکے چڑھ دوڑا۔ ماں نے خبر پائی تو فریدوں کو لیکے دوسرے مقام پر چلی گئی۔ برمایہ گائے رہ گئی جو ظالم کے ہاتھ سے بیگناہ ماری گئی۔ ماران ضحاک کی غذا کے لئے قضائے کار کاوہ آہنگر کے بیٹوں کی باری آئی۔ بڈھے لوہار نے گھبرا کے اپنا پیش بند

ہو گئے یہانتک کہ اُس کی زندگی کا خاتمہ کرادیا اور نوجوان بیٹے کی لاش باپ کے پاس بھجوادی۔ فریدوں اس غم میں نہایت بیقرار ہوا اور قسم کھا گیا کہ خون کا انتقام ضرور لیا جائیگا۔

منوچہر

ایرج کا بیٹا منوچہر جب سن شعور کو پہونچا تو خلان ناحق کے انتقام لینے میں کامیاب ہوا اور فریدوں کے سامنے سلم و تور کے سرکاٹ کے بھیجے۔ اسی وقت سے کیانیوں اور تورانیوں کی جنگ کا آغاز ہوتا ہے اور کیقباد۔ کیکاؤس و کیخسرو وغیرہ کی زندگی انھیں لڑائیوں میں ختم ہوتی ہے۔ زابلستان اور سیستان کے نبرد آزما۔ نریمان۔ سام۔ زال اور رستم کے کارنامے ان افسانوں کی آجتک زینت ہیں۔ اُدھر افراسیاب بادشاہِ توران کسی سے پست نظر نہیں آتا۔ رستم کے بیٹے سہراب کو باپ سے لڑوا دینا اور ایرانیوں کی زندگی کو تلخ کردینا اسی کا کام تھا۔ بالآخر کیخسرو کے ہاتھ سے افراسیاب مارا گیا اور قومی لڑائیوں کا فی الجملہ خاتمہ ہوا۔

کیقباد و کیکاؤس و کیخسرو۔

انشا سے تعجب کے ناظرین کو اس زمانے کے مختلف واقعات لٹریچر میں نظر آئیں گے۔ کہیں ہفتخوان رستم کا ذکر ہوگا۔ کہیں "نوشدارو پس از مرگ سہراب" کا محاورہ ملیگا۔ کہیں چاہ بیژن اور منیژہ کا حوالہ ہوگا۔ کبھی خون سیاوش۔ پر سیاوشان۔ کبھی سیمرغ اور کوہ قاف کے نام آئیں گے۔ جن کی تفصیل شاہنامہ وغیرہ میں ملیگی۔ افراسیاب کے بعد کیخسرو دنیا سے کنارہ کش ہو کے

اس نے آتش پرستی کو مٹا کے خدائے واحد کی پرستش اہل ایران
میں جاری کی۔

اشکانیاں

یونانیوں کی حکومت کے بعد پارتھیا کے لوگ یعنے **اشکانی**
حکمراں ہوئے جنھیں عرب کے مؤرخ ملوک الطوائف کہتے ہیں
اور اس خاندان کا خاتمہ **اردشیر بابکان** کے ہاتھ سے ہوا جو ساسانی
خاندان کا پہلا حکمراں تھا اور اپنا نسب ساسان بن بہمن
بن گشتاسپ تک پہونچاتا تھا۔

آل ساسان

آل ساسان کے افسانے کسی قدر تاریخی پہلو لئے ہوئے
ہیں۔ اسی خاندان کو اہل یونان "کسراس" اور عرب "اکاسرۂ عجم" کہتے
ہیں۔ تاریخ عرب و عجم میں ان بادشاہوں کے حالات نہایت
وقعت کے ساتھ درج ہوئے ہیں خصوصاً اردشیر و شاپور و نوشیرواں
کے قصے آجتک دنیا کو بتا رہے ہیں کہ نصفت و عدالت شان و
شوکت۔ سیاست و کیاست میں علم امتیاز انھیں کا بلند تھا مگر ارمنی
مؤرخین انکے خلاف ہیں کیونکہ ان سلاطین کے ہاتھوں عیسائیوں
کو شدید نقصانات پہونچے تھے۔

اردشیر

اردشیر بابکان کا پہلا کارنامہ یہ ہوا کہ **ملوک الطوائف**
کے آخری بادشاہ **اردوان** کو حکمت عملی سے زیر کیا اور میدان
جنگ میں شکست فاش دی۔ پھر قوم کرد پر حملہ آور ہوا اور
سلطنت کو ان کے دغدغے سے نجات دی۔ ہفتان بخت شہر
کرمان کی ایک بلا تھی جس سے تمام ملک پریشان تھا۔ اردشیر نے

---

[۱] واحد کسرے

مانی کا مذہب نور کو خیر اور ظلمت کو شر کہتا ہے اور تمام امور دنیا کو ظلمانیت یعنے خالق شر کا اثر سمجھتا ہے۔ لٹریچر میں بھی اتنا اثر موجود ہے کہ سیہ بخت سیہ روز۔ سیہ گلیم وغیرہ برے معنوں میں ہیں روشن روز۔ روشن روان وغیرہ اچھی حالت ظاہر کرتے ہیں۔ مانی کا مذہب چاہتا ہے کہ انسان بالکل دنیا کو ترک کرے اور گوشۂ تجرّد میں بیٹھ کے اپنے کو فنا کردے۔ اس مذہب کے پانچ درجے ہیں معلّمین (ابناء الرحم) مشمسین (ابناء العلم) قسیسین (ابناء العقل) صدیقین (ابنائے ذات غیر مرئی) سمّاعین (ابنائے ذکاوت)۔ (پروفیسر بیون کا خیال ہے کہ یہی صدیق رفتہ رفتہ زندیق ہوگیا اور خلیفہ مہدی باللہ کے زمانے میں تمام مانی کی امت کو زنادقہ کہنے لگے جن کا استیصال بنی عباس کے زمانے میں عرصے تک ہوا کیا)۔ مانی گوتم بدھ کو ہندوستان کا پیغمبر۔ جناب عیسیٰؑ کو سرزمین اسرائیل کا نبی اور اپنے کو بابل و نینوی وغیرہ کا پیغمبر سمجھتا تھا۔ اس کی کتابیں سات ہیں کتاب الہدیٰ والتد بیر سفر الجبابرہ۔ سفر الاسرار۔ کنز الاحیاء وغیرہ چھ کتابیں سریانی میں اور شاپورقان پہلوی میں ہے۔ اس نے اپنی تصانیف کے لئے ایک خاص خط ایجاد کیا تھا جو نہایت اہتمام سے لکھا جاتا تھا اور اسکے پیروؤں کا ایک گروہ اس رسم الخط کی خوشنمائی میں مدد دیتا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے مانی کو مصوّر سمجھا گیا ہے اور تصویر کشی اس کا معجزہ قرار دیا گیا ہے۔

غرض شاپور نے جب یہ مذہب قبول کیا تو ایرانیوں کو

یعنی الناس کو قائم کرنا چاہا اور خود پیغمبری کا دعوےٰ کیا۔ قباد خود بھی چاہتا تھا کہ کسی طرح موبدوں کا اثر کم ہو۔ اُس نے مزدک کو باریابی دی اور اُس کا دین قبول کیا۔ اس کا خیال تھا کہ تمام بُرائیاں حرص وحسد وغصہ کے شیاطین کی وجہ سے دنیا میں آئی ہیں۔ نوشیرواں نے اسکے نیرنگ اور شعبدوں کی حقیقت بیان کرکے باپ کے خیالات بدل دیے۔ پھر ایک روز مزدک اور اُسکے پیرووں کی دعوت ایک باغ میں کی اور ظاہر کیا کہ اس تقریب کے موقع پر میں آئین مزدک کو قبول کرونگا۔ مزدکی لوگ جوق جوق آنے لگے لیکن جو گروہ باغ میں داخل ہوا نوشیرواں کے سپاہیوں نے اُسے تہ تیغ کیا اور زمین میں سر کے بل دفن کردیا اور پاؤں باہر نکلے رہے۔ آخر میں مزدک آیا۔ اسے نوشیرواں نے یہ دردناک منظر دکھایا اور کہا کہ "تمہارے اقوال واعمال کے یہ درخت اُگے ہیں"۔ پھر اُسے بھی قتل کیا اور یوں ہی دفن کیا۔

نوشیرواں

نوشیرواں جب خود بادشاہ ہوا تو بقیہ مزدکیوں کو رہنا دشوار ہوگیا۔ بیشتر ہلاک ہوگئے اور باقی خفیہ طور سے اپنے عقیدے پر قائم رہے مگر علانیہ زرتشت کے مذہب کو مانتے رہے۔ اس کے بیٹے انوشہ زاد نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا لہذا باپ کا برتاؤ اس مذہب کے ساتھ بھی اچھا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائی مورخ عدالت نوشیرواں کی شہرت کا سبب مزدکیوں اور عیسائیوں کے قتل کو بتاتے ہیں جو موبدانِ

کمزور ہونے لگی پھر خسرو پرویز کی باری آئی مگر وہ زیادہ سلطنت نہ کرسکا اور اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس ظالم بیٹے نے بادشاہ ہوتے ہی اپنے اٹھارہ بھائیوں کو بھی قتل کرڈالا اور بالآخر خود بھی مر گیا۔ اسی زمانے میں مرض طاعون پھیلا اور رہا سہا ایران غارت ہوگیا۔ پھر اس کا ہفت سالہ بچہ اردشیر بادشاہ بنایا گیا مگر وہ بھی غاصب شہر براز کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پھر پوران دخت پرویز کی بیٹی بادشاہ ہوئی جس نے اپنی قابلیت خداداد سے ملک کی حالت بہت کچھ درست کی مگر موت نے اُسے بھی مہلت نہ دی۔ اسکے بعد پیروز پھر اُسکی بہن آرزم دخت کو سلطنت ملی مگر یہ سب بھی تباہ ہوئے۔ خلاصہ یہ کہ خسرو پرویز سے لیکے یزدجرد سوم تک تیرہ بادشاہ ہوئے اور پانچ برس کے عرصے میں سب ختم ہوگئے۔ آخری بادشاہ عربوں سے شکست کھاکے بھاگا اور ایک بے حقیقت مخلوق کے ہاتھ سے طمع زر میں مارا گیا۔

اب اس خاندان کے قصے زبانوں پر ہیں اور کتابے شکستہ دیواروں پر۔ اسلام کے آنے سے ایران کی حالت بالکل بدل گئی۔ نہ وہ لٹریچر رہا۔ نہ وہ مذہبی خیالات۔ نہ وہ عقائد۔ نہ وہ رسوم۔ البتہ دوربین نظریں آنے والے تمدن میں مٹے ہوئے نشان ان صنادید عجم کے دیکھتی ہیں اور چشم ظاہر بیں کے لئے صرف اتنا ہے کہ

پردہ داری می کند بر طاق کسریٰ عنکبوت　　چغد نوبت میزند بر گنبدِ افراسیاب

وہاں عربی حروف کا داخل کرنا آسان تھا۔ غیر مشترک آوازوں کے لئے پ۔ چ۔ ژ۔ گ اختراع کئے گئے اور یائے فارسی۔ جیم فارسی۔ زائے فارسی اور کاف فارسی نام رکھے گئے۔ پھر عربی صرف و نحو کی تقلید شروع کی اور اضافت و توصیف و تصغیر و نسبت وغیرہ کو اختیار کرکے زبان کو وسیع کیا۔ اسکے بعد عربی الفاظ و محاورات پر تصرّف شروع کئے اور معنی وضعی کا فی الجملہ لحاظ کرکے اپنی زبان میں نازک طریقوں سے الفاظ عرب کا استعمال شروع کیا مثلاً سَیر عربی میں چلنے کو کہتے ہیں لیکن فارسی میں سیر کردن محض دیکھنے کے معنوں میں رہ گیا اور تماشا کا بھی یہی حال ہوا کہ "نظارہ" کے حدود میں آگیا۔ یا شمّہ عربی میں سونگھنا تھا۔ فارسی میں ذرا سی چیز کو کہتے ہیں (جتنی شاید سونگھنے کو درکار ہوتی ہے)۔ اسی طرح ارتفاع و سبق وغیرہ وغیرہ بکثرت الفاظ ہیں جنکے عربی و فارسی معانی میں تفاوت بعیدہ ہوگیا ہے حالانکہ بالاصالۃ عربی ہیں۔ اسکے علاوہ بہت سے مشدّد الفاظ کی تشدید کو دور کیا کہ زبان میں ثقل نہ پیدا ہو۔ خاصیت وکیفیت وجادہ وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ پھر عربی مرکبات کو بطور مفرد بولنا شروع کیا۔ ماجرا۔ ماورا۔ ماسوا وغیرہ کے لفظی معنی دیکھو اور فارسی میں ان کا بے تکلف استعمال دیکھو۔ عربی محاورات کو بھی اپنی زبان میں داخل کیا مثلاً زر خالص کو زر جعفری کہنے لگے حالانکہ نسبت خود بتاتی ہے کہ جعفر برمکی کیوجہ سے عرب میں خالص سونے کا چلن ہوا تھا عجم سے کیا واسطہ؟ اور زر مغربی

عرب کے تمدن و معاشرت کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملوک حمیر و غسّان وغیرہ کے درباروں کے علاوہ اس ملک میں بدویت غالب تھی اور صرافتِ نسب۔ حمیّت قوم۔ آزادیٔ خیال یہاں کے رہنے والوں کے خاص جوہر تھے۔ یہ قوم اگرچہ قعرِ جہالت میں پڑی تھی اور (بقول گبن) علوم و فنون کی لہریں اوپر ہی اوپر گذر جاتی تھیں اور ان لوگوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی لیکن فنِ شعر و خطابت میں انھیں یدِ طولیٰ ہو گیا تھا۔

حقیقتِ شعر

حقیقتِ شعر[1] کے جاننے والے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ شاعری ایک وجدانی اور ذوقی چیز ہے جس کا تعلق احساس سے ہے۔ احساس کسی اثر ڈالنے والے واقعے سے متاثر ہونے کو کہتے ہیں اور ادراک اشیا کا معلوم کرنا اور استدلال و استنباط سے کام لینا ہے۔ مثلاً کسی واقعے سے صدمہ ہونا یا کسی بات پر حیرت ہونا یا کسی امر سے خوش ہو جانا یہ سب احساسات ہیں اور شعر فی الحقیقت احساسات کی تصویر ہے جو الفاظ میں کھینچی جاتی ہے اس غرض سے کہ یہ تصویر دوسروں کے دلوں پر وہی اثر ڈالے جو قائل کے دل پر پیدا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین فلک نیلگوں۔ نجم درخشاں۔ نسیم صبح۔ شادابیٔ چمن۔ ویرانیٔ بیابان وغیرہ کو شعر سمجھتے ہیں کیونکہ ان چیزوں سے دل پر اثر ہوتا ہے۔

محاکات

اس تصویر کشی کا علمی نام محاکات ہے جس کا موقلم تخییل ہے

---

[1] مولانا شبلی نعمانی نے شعر العجم کی چوتھی جلد میں اس پر محققانہ بحث لکھی ہے جو قابل ملاحظہ ہے۔ یہاں بھی اکثر وہیں سے درج کیا گیا ہے۔

کرتی ہے بلکہ اگر ادراکات بھی قیدِ وزن و قافیہ وغیرہ میں آتے ہیں تو اُن پر
بھی شاعرانہ رنگ چڑھا دینا اسی قوتِ اختراع کا کام ہے مثلاً آفتاب
کا وقت طلوع سُرخی مائل ہونا۔ دریاؤں کا بہنا۔ حبابوں کا اُبھرنا
اور پھوٹنا۔ موجوں کا دریا کے کناروں سے ٹکرانا۔ ان موجودات خارجی
کا حال اتنے ہی الفاظ میں بیان کر دینا محاکات ہے جیسا کہ اکثر نیچرل
نظموں میں آجکل نظر آتا ہے۔ انیسؔ نے بھی اسی حالت کا نقشہ
کھینچا ہے اور اس محاکات پر دو طرح کے رنگ چڑھائے ہیں۔ ایک رنگ
وہ ہے جو ہر صاحب ذوق کو روزانہ نظر آتا ہے اور شاعر کی قوت تخیل
ان موجودات کے مشابہات بیان کر کے تصویر میں رنگ بھرتی ہے
(اس مثال میں محض آفتاب نکلنے کا ذکر ہے) :-

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح — گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح — سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گذارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

دوسرا سماں صبح عاشور کا ہے۔ شاعر موجودات خارجیہ کی تصویر
کھینچتا ہے مگر اسی رنگ میں جو اُسے نظر آتا ہے کیونکہ خود مسلمان ہے
اور حسینؑ مظلوم کا ماتمدار :-

تھا بسکہ روزِ قتلِ شہِ آسماں جناب — تھا خوں کو ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب
تھی نہرِ علقمہ بھی خجالت سے آب آب — روتا تھا پھوٹ پھوٹ کے دریا میں ہر حباب
اک دھوم تھی جو قتلِ شہِ کائنات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی

نفاست میں فرق نہ آئے۔

یہ تو نہ کہہ سکے کہ شۂ مشرقین ہوں　　　مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں

تخییل کا زور یہ ہے کہ شاعر کائنات کو اپنے رنگ میں کھینچ لاتا ہے۔ تخییل کا زور بادشاہ کے تاج کے لئے موتی درکار ہوتے ہیں تو یوں کہتا ہے :۔

علم برکش ای آفتابِ بلند　　　خراماں شو ای ابرِ مشکیں پرند

بیاد ای ہوا قطرۂ ناب را　　　بگیرای صدف درکن آں آب را

برآ ای دُرِ از قعرِ دریای خویش　　　بہ تاجِ سرِ شاہ کُن جای خویش

اگر ان اشعار میں قوت تخییل خطاب کا رنگ نہ بھرتی تو محاکاتِ محض تھی کیونکہ اُس زمانے کے لوگ موتی کی پیدایش یوں ہی مانتے تھے مگر قوتِ تخییل نے خطاب کا رنگ بھر کے سطوت شاہانہ کو ظاہر کر دیا جس کے بغیر تصویر ناقص رہی جاتی تھی یا مثلاً باز وغیرہ کی عادت ہوتی ہے کہ بار بار اُس تسمے کو نوچتے ہیں جن سے پاؤں بندھا ہوتا ہے۔ بادشاہ کے ہاتھ پہ یہی باز بیٹھا ہے سلمان ساوجی محاکات کے ساتھ ساتھ صنعت حسن تعلیل اپنی قوت تخییل سے پیدا کرتا ہے اور یوں کہتا ہے :۔

گشتست پای باز مشرّف بدست تو　　　بر پای خویش بوسہ بیابی ازاں دہد

یا مثلاً مسائل فلسفہ و منطقیہ وغیرہ پر نظر ثانی کی جاتی ہے تو قوت تخییل اُن رازوں کو کھول دیتی ہے جو روکھا سوکھا فلسفہ کبھی ادا نہ کر سکتا۔

موجیم کہ آسودگی ما عدم ماست　　　ما زندہ بہ آنیم کہ آرام نگیریم

دیکھنا کس لطف سے اس مسئلہ کا انکشاف ہوا کہ جو چیز ساکن نظر آئے اُس کے بھی ذرّات ضرور متحرک ہونگے کیونکہ سکونِ محض کا نتیجہ عدم ہے اور وجود حرکت کا نتیجہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اہل فلسفہ اسے قضیہ شعریہ

کبھی کبھی حقیقت سے بھی دور ہو جاتی تھی مگر ایسی جدّت معیوب تھی۔ نابغہ نے عمدہ شعر کی تعریف میں جو کہا تھا اُس کا نظامی نے یوں ترجمہ کیا ہے۔

درشعر مپیچ و در فن او　　　چوں اکذب اوست احسن او

یہ بھی ایک آزادی خیال کی دلیل ہے ورنہ قضیۂ شعریہ کے سلسلے میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ جدّت تخییل سے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں۔ اس قوم کے عشق و حسن کے افسانے بھی بالکل نیچرل ہیں اور اُس کے عنوان اظہار بھی سراسر موافق فطرت ہیں۔ بنی اُمیہ کے دور میں سلطنت قائم ہوئی تو آزادی خیال پر دوسرے تمدّن کا اثر ہوا جس زمانے میں جھوٹی حدیثیں بننا آسان ہوں اگر شعر بھی جھوٹی مدح سرائیوں کے کام میں آنے لگا ہو تو مستبعد نہیں۔ خلفائے عباسیہ کے دور میں تو کچھ ایسا ہوا کہ فن شعر پرانی روش سے بالکل جدا ہو گیا۔ سلاطین و وزرا کو خوش کرنا اور انعامات و جائزات حاصل کرنا شاعروں کا پیشہ ہو گیا۔ یہ زمانہ خالی محاکات یا سچی تعریفوں کو کہاں پسند کر سکتا تھا۔ قوت تخییل نے غلبہ حاصل کیا۔ جدّت طرازیاں اور رنگ آمیزیاں ہونے لگیں۔ ہر شاعر یہ چاہتا تھا کہ کوئی نیا مضمون باندھے تاکہ زیادہ انعام ملے۔ غرض کہ اس عہد (۸۰۰ء) میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا دور ہو گیا اور متنبّی اور ابو العلاء معری وغیرہ کا رنگ پھیل گیا۔

عجم میں تقلید عرب

ایرانیوں میں جو علمی رنگ عربوں کا اچھی طرح پھیلنے لگا وہ اسی زمانے کا رنگ تھا۔ یہ رنگ زیادہ تر خطابت کا تھا جو شعر کے رنگ پر غالب آگیا تھا۔ سامعین کو محظوظ و متاثر کرنا شاعروں کا فرض تھا ورنہ حقیقت میں

کہاہے اور بعض نے یونانی لفظ "سفاس" سے اسکا اشتقاق کیا ہے۔ اس فرقے کی ابتدا اُس مخالفت سے بتائی گئی ہے جو دنیوی تلذّذ اور عیش سے زہّادِ قوم میں پیدا ہو جاتی ہے اور لباسِ صوف سے اس امر کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو دنیوی لذتوں سے کوئی سروکار نہیں جس زمانے میں فارسی لٹریچر کی بعدِ ظہورِ اسلام ابتدا ہونے والی تھی اُس وقت تک حسن بصری۔ سفیان ثوری فضیل بن عیاض۔ ابراہیم ادہم۔ رابعۂ عدویہ وغیرہ گذر چکے تھے جو اس فرقے کے سلف صالح کہلاتے ہیں۔ ان لوگوں کا اعتقاد تھا کہ خدا فاعل مطلق ہے اور خیر و شر محض اُن اعتبارات کے نام ہیں جو انسانوں نے قائم کئے ہیں۔ رفتہ رفتہ وحدت حقیقی کا پرتوان لوگوں کو نظر آیا اور "ہمہ اوست" کا اعتقاد راسخ ہوا۔ انکے اقطاب و اوتاد وغیرہ کے حالات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وحدت الوجود کے ساتھ ساتھ بے ثباتی عالم پر وثوق بلکہ وجود اشیا کو موہوم سمجھکر اُن سے کنارہ کشی۔ ریاضتہاے شاقہ میں عمر بسر کرنا اور فنا ہو کر بقا حاصل کرنا اس فرقے کے خصوصیات میں سے تھا اور جن انشا پردازوں پر اس رنگ کا اثر پڑا ہے انکے اقوال سے فلسفۂ اخلاق اور الٰہیات کے عجیب عجیب مسائل حل ہوئے ہیں جن کا ذکر مناسب مقاموں پر آئے گا حسن مطلق سے عشق انکا شعار تھا اور مجاز کو حقیقت کا زینہ سمجھتے تھے۔ توحید باری سے مراد انکے نزدیک محض نفی شرک نہیں بلکہ ماسوی اللہ کو بے حقیقت سمجھنا ہے اور حقیقت محض اُسی کی "ذات واحد" کو ماننا ہے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ چونکہ خدا ایک خزانۂ مخفی تھا اور (موافق الفاظ حدیث قدسی) اُس نے محض اپنی معرفت کے لئے خلق کو پیدا کیا

باب چہارم

طاہریہ وصفاریہ

مامون الرشید کا زمانہ

جنگ قادسیہ سے **مامون الرشید** کے عہد تک تقریباً دو سو برس کا زمانہ گزرتا ہے۔ اس اثنا میں عجم پر علوم عرب کا کیا اثر ہوا اس کی تفصیل کے لئے اُن مصنّفات علمیہ کو دیکھنا چاہیئے جو اہل عجم کے قلم سے عربی زبان میں لکھے گئے کیونکہ نئی روشنی نے اس زمانے کے لوگوں کو ایسے عالم انوار میں پہونچا دیا جہاں قبل اسلام کی زبان اور خیالات کا رنگ بالکل ماند ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے آئمۂ حدیث و لغت و فلسفہ و فقہ و اصول یہی ایرانی لوگ تھے اور نشر علوم اسلامیہ و اصلاح معارف ملّیہ میں جسقدر کوشش ایرانیوں کے دست و قلم سے ہوئی اُس کا اندازہ تاریخ اسلام کے پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ فارسی زبان میں لکھنے پڑھنے کا آغاز مامون رشید کے عہد میں معلوم ہوتا ہے اور مرو کا ایک شاعر **ابو العباس** اس قابل نظر آتا ہے جس کا نام ابتدا میں لیا جائے[1] اس نے مامون رشید کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کے آخری اشعار میں فارسی کا پہلا شاعر ہونے کا دعوےٰ کیا ہے۔

ابو العباس مروزی

ای رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرقدین
گستر انیدہ بہ فضل وجود در عالم یدین

---

[1] صاحب مجمع الفصحا نے اس سے قبل بہرام اور ابو حفص سغدی کا ذکر کیا ہے۔

اور اسکے خاندان کو مثل خود مختار حکمرانوں کے بتا دیا تھا۔ یہ خاندان عربی نژاد تھا لیکن دربار کی زینت کے لئے شعرا کا ہونا بھی لازم تھا اس لئے بعض شاعر پیدا ہو گئے۔

حنظلۂ باذغیسی غالباً پہلا شخص ہے جس نے باقاعدہ شاعری اختیار کی۔ صاحب چہار مقالہ نے اسے صاحب دیوان کہا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں۔

یارم سپند گرچہ بر آتش ہمی فگند	از بہر چشم تا نرسد مر ورا گزند
او را سپند و مجمرہ ناید ہمیں بکار	با روے ہمچو آتش و با خال چوں سپند

اسی حنظلہ کے دو شعر چہار مقالہ میں درج ہیں جنھیں پڑھ کے احمد خجستانی حکومت کے شوق میں اپنے گدھے بیچ کے نکل کھڑا ہوا اور رفتہ رفتہ بیہق و خواف و نیشاپور پر قابض ہو گیا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر دیوان حنظلہ نہ پڑھتا تو یہ حکومت نہ ملتی (پروفیسر براؤن کا قیاس ہے کہ سامانیوں کے زمانے میں اس عہد کے فارسی اشعار زبان زد خاص و عام تھے۔ اگرچہ شعرا کے نام نہیں ملتے نہ کلام ملتا ہے) سال وفات حنظلہ کا ۲۱۹ھ ہے۔

محمود وراق ۲۲۱ھ میں فوت ہوا۔ محمد بن طاہر کا درباری تھا۔ دو شعر اسکے نقل کئے گئے ہیں:۔

نگارینا بہ نقد جانت ندھم	گرانی در بہا ارزانت ندھم
گرفتستم بہ جاں دامانِ وصلت	نہم جاں از کف و دامانت ندھم

دیکھنا! ان اشعار میں غزل گوئی کی ابتدا نظر آتی ہے۔ عرب تشبیبِ قصیدہ میں عاشقانہ اشعار کہتے تھے۔ شاید اسی ٹکڑے کو ایرانیوں نے

عیش کے متوالے انھیں گاتے تھے اور جی بہلاتے تھے۔ مگر ان چٹکلوں سے حقیقی شاعری کا قائم ہونا دشوار رہے۔

رباعی کا آغاز

صفاری خاندان کی ایک عظیم یادگار عالمِ شعر میں آجتک باقی ہے جسے رباعی کہتے ہیں۔ یعقوب کا ایک کمسن بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ شرط یہ تھی ایک گڑھے میں اخروٹ تاک تاک کے ڈالے جائیں۔ اس بچے نے جو اخروٹ پھینکا تو گڑھے میں نہ گیا۔ اداس ہوگیا اتفاقاً وہ اخروٹ لڑھکتا ہوا الٹا پلٹ آیا اور گڑھے میں گر گیا۔ بچہ فرط جوش میں کہنے لگا "غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو" باپ کو یہ کلامِ موزوں پسند آیا۔ شعرا سے کہا کہ اسکی تقطیع کرو۔ اسوقت تک اس بحر میں شعر نہیں کہے گئے تھے۔ تقطیع میں دشواری ہوئی۔ بعد جد و جہد ہزج میں تقطیع ہوگئی۔ پھر تین مصرعے لگا کر رنگ زمانہ کے موافق دو بیتی بنالی۔ مدتوں یہی صنف دو بیتی کہلائی پھر رباعی نام ہوگیا۔ کیا معلوم تھا کہ یہ معمولی ابتدا عمر خیام اور سحابی کے سے رباعی گو پیدا کریگی جو فارسی شعر کے لئے مایہ ناز ہوجائیں گے۔

———>※<———

آل سامان کا آغاز

مامون الرشید کا جب مرو میں قیام تھا تو ایک شخص **اسد بن سامان** دربار میں حاضر ہوا تھا جو کھرا ایرانی تھا اور بہرام چوبین کی نسل میں سمجھا جاتا تھا۔ مامون کی مرحمت سے اس کے چاروں بیٹوں کو مختلف بلاد کی حکومتیں ملیں۔ **نوح** کو **سمرقند** ملا۔ احمد کو **فرغانہ**۔ یحییٰ کو **شاش** اور **الیاس** کو **ہرات**۔ **نوح** کے بعد اس کا بیٹا **احمد** حاکم سمرقند ہوا۔ لیکن چند روز کے بعد اپنے بیٹے **نصر** کو قائمقام کر کے خود گوشہ نشین ہوگیا۔

۲۶۱ھ میں معتضد باللہ نے اُسے ماوراء النہر کی حکومت دی۔ اس نے اپنی طرف سے **اسمٰعیل** کو بخارا کا حاکم مقرر کیا۔ دراندازوں نے دونوں بھائیوں کو لڑوا دیا اور **نصر** گرفتار ہو کے **اسمٰعیل** کے سامنے آیا مگر اسمٰعیل نے باوجودِ فتح دست بعذرت معذرت کی اور **نصر** کا ماتحت رہا۔ اُس کے انتقال کے بعد ۲۷۹ھ میں **اسمٰعیل** کو سمرقند کی بھی حکومت ملی۔

آل سامان کی حکومت

اسی تاریخ سے آل سامان کی حکومت کا آغاز ہوا اور **اسمٰعیل** سامانیوں کا پہلا حکمراں قرار پایا۔ اسی نے صفاریوں کا بھی خاتمہ کیا یہانتک کہ ۲۹۵ھ میں انتقال کر گیا۔ اسمٰعیل کے بعد **احمد بن اسمٰعیل** جانشین ہوا اُس کے بعد **نصر بن احمد** تخت نشین ہوا۔ **رودکی** اسی کی خوان دولت کا پروردہ ہے جو **آدم الشعرا** کہلاتا ہے۔ ۳۳۱ھ میں **نصر** نے وفات پائی اور اُسکا بیٹا **نوح** وارث تخت ہوا۔ یہ بھی مربی علوم وفنون تھا خلفائے عباسیہ کے زمانے میں یونانی فلسفہ کا ترجمہ خوب ہو چکا تھا لیکن بعض باتیں مبہم رہ گئی تھیں۔ **نوح** نے **ابونصر فارابی** کو حکم دیا کہ سب ترجموں کو سامنے رکھ کے ایک جامع اور معتبر ترجمہ تیار کرے چنانچہ تعمیل حکم کی گئی اور کتاب کا نام **تعلیم الثانی** رکھا گیا جسکی وجہ سے **ابونصر فارابی** کا لقب بھی **معلم ثانی**

آل بویہ

کیا تھا حالانکہ یہ انتساب بالکل بے بنیاد تھا۔ اسی عہد میں آل بویہ ترقی کی معراج پر پہونچ گئے جو بہرام گور کی نسل میں تھے اور منصب امیر الامرائی پر فائض ہو کے تمام کاروبار خلافت کے مالک بن گئے تھے اور دیلمیوں اور گیلانیوں کی مدد سے بویہ کے تینوں بیٹے عماد الدولہ۔ رکن الدولہ اور معز الدولہ کا قبضہ اصفہان۔ نوبندجان۔ گازروں۔ شیراز اور کرمان وغیرہ پر ہو گیا تھا حقیقت یہ ہے کہ علمی اعتبار سے یہ انقلابات نہایت مفید ثابت ہوئے۔ ہر خاندان اپنے اپنے مقام پر تربیت اہل علم میں مصروف تھا۔ اساطین حکما و علما و مورخین و شعرا وغیرہ کا ظہور اسی زمانے میں ہوا۔ اگر تاریخ انشائے عرب لکھنے کا موقع ہوتا تو معلوم ہوتا کہ متنبّی سا شاعر۔ ابن زکریا سا طبیب۔ طبری سا مورخ اور شیعوں اور سنیوں کے کامل فقیہ و محدث وغیرہ اسی عہد میں گزرے۔ حسن بن منصور حلاج کا ظہور بھی اسی عصر میں ہوا جس نے تصوف کی روح بلاد اسلام میں پھونک دی لیکن انشائے عجم کا تعلق چونکہ آل سامان سے ہے لہذا اب اصل مقصود کیطرف توجہ کی جاتی ہے۔

ترجمہ تاریخ طبری

فارسی نثر کی پہلی کتاب منصور بن نوح[۱] نے اپنے وزیر سے لکھوائی یعنے تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ[۲]۔ اس کی خوبی کے متعلق شمس العلما آزاد دہلوی لکھتے ہیں کہ "تم نے پڑھے طوطے اور بولتی مینا کو دیکھا ہوگا۔ جبتک پنجرے میں ہوتے ہیں سیکھی ہوئی بولیاں بولتے ہیں جب پنجرے سے چھٹ جاتے ہیں تو درختوں پر جاتے ہی اپنا جنگلا بولنے لگتے ہیں۔

---

[۱] وفات ۳۶۵ھ۔ [۲] تعجب ہے کہ بعض واقعات اصل کتاب میں موجود ہیں وہ ترجمے میں نہیں ہیں اور بعض واقعات جو ترجمے میں نہیں ہیں وہ اصل کتاب میں نہیں ملتے

کہیں کہیں خالص فارسی کی بھی چاشنی ہے۔مگر بندشیں نہایت ڈھیلی۔ ابھی عالم طفولیت ہے۔شباب کے زمانے میں انشا کا رنگ بدلے گا۔

شعرائے عصر

شعرائے عصر کی تعداد سینکڑوں تک پہونچتی ہے مگر مشہور نام یہ ہیں۔ابوالعباس۔ابوالمثل۔ابواسحٰق جوئباری۔خبازی نیشاپوری۔ابوالحسن کسائی۔شہید بلخی۔ابوعبداللہ فرالاوی۔رودکی۔دقیقی۔رابعہ فرداری۔معمر جرجانی۔ ابوالمظفر نصر بن محمد نیشاپوری وغیرہ۔جن میں سے ابوعبداللہ فرالاوی اور شہید بلخی کو شاید اقدمیت کا شرف حاصل ہے۔رودکی نے شہید کا مرثیہ بھی کہا ہے :۔

کاروانِ شہید رفت از پیش   وانِ ما رفتہ گیر وحی اندیش
از شمارِ دو چشم یکتن کم   وز شمارِ خرد ہزاراں بیش

رابعہ

رابعہ کے نام نے اس عہد میں ایک خصوصیت اور ظاہر کی وہ یہ کہ عورتیں بھی شعر کا مذاق رکھتی تھیں۔اس کا باپ کعب اعراب میں سے تھا۔خود عجم میں پیدا ہوئی تھی۔نہایت حسین اور صاحب فضل و کمال تھی۔یکتاش نام غلام سے اسے الفت تھی۔مجازی حالت جب حد سے گذری تو حقیقت کا مرتبہ آیا اور صوفیہ میں شمار ہونے لگا۔مگر اسلامی جماعت میں عورت کا اجنبی مرد سے محبت کرنا معیوب تھا لہذا لوگوں نے رابعہ کو قتل کر ڈالا۔مولانا شبلی نے یہ دو شعر منتخب فرمائے ہیں۔

دعوتِ من بر تو آں شد ایزدت عاشق کناد
بر یکے سنگیں دلے نامہرباں چوں خویشتن

اچھی ہو سکتی۔ عنصری نے اس کا ذکر کیا ہے۔

چہل ہزار درم رودکی زمہتر خویش عطا گرفت بہ نظم کلیلہ در کشور

ایک مرتبہ امیر نصر بادغیس میں آیا جہاں کی آب و ہوا اتنی پسند آئی کہ چار برس مقیم رہا۔ آخر اُمرا و اہل فوج عاجز آ گئے اور چاہا کہ وطن واپس جائیں۔ رودکی سے کہا کہ پانچ ہزار اشرفیاں دینگے اگر امیر کو یہاں سے لے چلو۔ رودکی نے منظور کر لیا اور امیر کے سامنے یہ اشعار گائے :۔

بوے جوے مولیاں آید ہمی یاد یار مہرباں آید ہمی

ریگ آموی و درشتیہای آں زیر پایم پرنیاں آید ہمی

آب جیحوں با ہمہ پہنادری خنگ مارا تامیاں آید ہمی

ای بخارا شاد باش و شاد زی شاہ سویت میہماں آید ہمی

شاہ سرو است و بخارا بوستاں سرو سوے بوستاں آید ہمی

شاہ ماہ است و بخارا آسماں ماہ سوے آسماں آید ہمی

نصر کی نظروں میں وطن کا نقشہ پھر گیا اور ایسا خوش ہوا کہ موزے تک نہ پہنے اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل کھڑا ہوا یہاں تک کہ ایک منزل پر جا کے دم لیا۔ یہ ہے حقیقی شاعری کا اثر۔ اندھا شاعر اُتنا ہی کہتا ہے جتنا احساس ہوتا ہے۔ اپنے وطن کی نہر مولیاں کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ صرف خوشبو پر اکتفا کی ہے۔ وطن کی صعوبتوں کو کتنا آسان سمجھتا ہے کہ دریا کی ریت اُسے ریشم معلوم ہوتی ہے۔ دولت شاہ وغیرہ کے زمانے میں مذاق اتنا بدل گیا تھا کہ ان اشعار کے موثر ہونے پر اُسے تعجب ہے لیکن اس زمانے کے لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ جدید نیچرل نظموں سے یہ نظم کچھ کم نہیں صاحب

لہ دریائے جیحوں

بادہ واپرست ایں جہاں فسوس باده پیش آر ہرچہ بادا باد

اللہ ری سادگیِ ادا اور بے تکلفی اور یہ فلسفیانہ مضمون!

(۳) مدحیہ رنگ میں قوتِ تخیل دیکھو:۔

شاہے کہ بروز رزم از رادی زرّین نہد بہ تیر در پیکاں
(سخاوت ۱۲) (اعلانِ لون ۱۲)
تاکشتۂ او ازاں کفن سازد تاخستۂ او ازاں کند درماں
(اس کی قیمت سے ۱۲)

(۴) واقعہ نگاری کا نمونہ بادغیس کے واقعے میں درج ہوا۔

(۵) مرثیہ کا نمونہ شہید بلخی کے حال میں لکھا جاچکا۔

(۶) غزل نے مستقل صورت اختیار نہیں کی تھی قصیدے کی تشبیب میں عاشقانہ رنگ کے اشعار اس کا نمونہ ہو سکتے ہیں۔ عنصری نے اس صنف میں رودکی کے کمال کا اعتراف کیا ہے جیسا کہ مذکور ہوا۔

(۷) قصیدہ گوئی کے حدود ایسے قائم کئے کہ آجتک اضافہ نہ ہو سکا۔ تشبیب تخلص۔ مدح۔ خاتمہ کے مقامات قابل دیکھنے کے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ الفاظ میں جزالت و متانت اور معانی میں قوتِ تخیل کامل طور سے نظر آتی ہے۔ ایک تشبیب ملاحظہ ہو:۔

بیار آں می کہ پنداری رواں یاقوت نابستی ویا چوں برکشیدہ تیغ اندر آفتابستی
(یای زائدہ ۱۲)
بپاکی گوئی اندر جام مانند گلابستی[1] بہ خوشی گوئی اندر دیدۂ بیخواب خوابستی
(پرانا تلفظ ۱۲)
سحابستی قدح گوئی و می قطرۂ سحابستی طرب گوئی کہ اندر دل دعای مستجابستی

اگر می نیستی یکسر ہمہ دلہا خرابستی اگر در کالبد جاں را ندیدستی شرابستی

ظہوری کے ساقی نامہ میں پیچ در پیچ تخیل نے سادگیِ ادا کو مٹا دیا۔

---

[1] متوسطین و متاخرین نے اس تلفظ کو ترک کر دیا تھا قاآنی وغیرہ نے پھر اختیار کیا ہے۔

سمجھتے ہیں مگر "رتبۂ کلام" کو مانتے ہیں اور معرکہ آرائی کے سماں کا نمونہ یہ پیش کرتے ہیں کہ تقابل کا اہل نظر کو موقع مل جائے :-

زبس بانگ اسپان و جوش و خروش | ہمی نالۂ کوس نشنیدہ گوش
درفشانِ بسیار افراشتہ | سر نیزہا زابر بگذاشتہ
چو رستہ[۱۲] درخت از برِ کوہسار | چو بیشۂ نیستاں بوقتِ بہار
ز تاریکیٔ گرد و بانگ سیاہ | کسے روز روشن نمیدید راہ
بکردند یک تیر باراں نخست | بسانِ تگرگ بہاراں درست
بپوشیدہ شد چشمۂ آفتاب | ز پیکانہائے درخشاں چو آب
تو گفتی ہوا ابر آرد ہمی | وزاں ابر الماس بارد ہمی

ایک مرتبہ فردوسی نے دقیقی کو خواب میں دیکھا تھا کہ وہ اپنے گشتاسپ و ارجاسپ کی لڑائی کے بھی ہزار اشعار شاہنامہ میں داخل کرنے کی فرمایش کرتا ہے۔ فردوسی شاہنامہ میں کہتا ہے :-

پذیرفتم و داشتم زو سپاس | مرا در دل آمد زہر سو ہراس
کہ روزے مرا ہم ببایدگزشت | زگفتار او در نشاید گزشت

غرض یہ اشعار نقل کئے۔ اسکے بعد شاعرانہ تعلّی کا جوش ہوا۔ ختم کرکے کہتا ہے :-

دو گوہر[۱] نمودم بہ گوہر فروش | کنوں شاہ دارد بگفتار گوش
سخن چوں بدینگونہ بایدت گفت | مگوی و مکن رنج با طبع جفت
چو طبعت نہ باشد چو آبِ رواں | مبر دست زی نامۂ خسرواں

مولانا شبلی کہتے ہیں کہ دقیقی پہلا شخص ہے جس نے فارسی کو عربی

---

[۱] یعنے اپنے اور دقیقی کے اشعار۔

اُسے پکا مسلمان کہتے ہیں مجمع الفصحا وغیرہ میں اسکے وعظیہ و مدحیہ اشعار بھی درج ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہر صنف میں کچھ نہ کچھ کہتا ضرور رہے۔

منجیک — اسی عصر کے اور شعرا ہیں جن کا کلام کم ملتا ہے مثلاً منجیک جو امراے چغانیہ کا مداح تھا۔ صاحب مجمع الفصحا نے اسکے اشعار ملوک صفاریۂ سیستان کی تعریف میں بھی نقل کئے ہیں۔ اسی طرح منطقی رازی کے اشعار درج ہیں — منطقی — جو دیلمیوں کے وزیر صاحب بن عباد کا مداح تھا۔ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ اسے حسن تعلیل وغیرہ کا بہت شوق تھا اور اسے دربار عراق کا اثر سمجھا ہے جہاں شاعری میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی جتنی آل سامان کے دربار میں پائی جاتی تھی۔ ابو عبداللہ محمد جنیدی بھی صاحب — جنیدی — بن عباد کے شعرا میں سے تھا۔ امیر قابوس کے دربار میں نہایت اچھے اچھے شاعر تھے۔ بعضے غزنویوں کے عہد میں بہت مشہور ہوئے جنکا ذکر آیندہ باب میں آئے گا اور بعضے سامانیوں کے عہد میں ختم ہو گئے۔

خاتمۂ باب میں اُن امرا و ملوک کا ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے علاوہ انشا پروری کے خود بھی انشا پردازی کی ہے خصوصاً ابو ابراہیم اسمٰعیل سامانی — اسمٰعیل سامانی — جسکے بعض اشعار سے اندازہ ہوگا کہ ان لوگوں کی ہمتیں کتنی بلند تھیں اور زبانیں کیسی شستہ تھیں۔

گویند مرا خود زچہ رو خوب نسازی	منزل گہ آراستہ و فرش ملوّن
با نعرۂ گرداں چہ کنم لحن اغانی	یا پویۂ اسپاں چہ کنم مجلس گلشن
اسپ است وسلاح است مرا بزم گہ و کاخ	تیر است و سناں است مرا لالہ و سوسن
جوش مَی و نوش لب ساقی بچہ کار است	جوشیدن خوں باید بر عیبۂ و جوشن

منصور ثانی سامانی بھی شاعر تھا اور اچھا شاعر تھا۔ معاصرین میں امیر

غزنویہ

سلاطین غزنویہ کا عہد اگرچہ زیادہ دیرپا نہیں ہے مگر فارسی لٹریچر کی جان ہے۔ عبدالملک بن نوح سامانی کا ایک غلام **الپتگین** نام ترقی کر کے خراسان کا گورنر ہو گیا۔ منصور بن عبدالملک کے عہد حکومت میں وہ غزنین چلا گیا اور سولہ برس حکومت کر کے وہیں فوت ہو گیا۔ پھر ابو اسحٰق بن الپتگیں وارث ہوا لیکن چند روز کے بعد مر گیا۔

الپتگین

الپتگین کا ایک غلام سبکتگین تھا جس کی قابلیت کے اعتراف کی وجہ سے جمہور نے اُسے غزنین کا حاکم مقرر کیا۔ یہی خاندان غزنویہ کا مؤسس ہے۔ جیپال کو ہندوستان میں اسی نے بار بار شکست دی اور سامانی دربار سے ناصر الدین کا خطاب پایا۔ اسکی وفات کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل

سبکتگین

جو الپتگیں کا نواسا تھا بلخ میں تخت نشین ہوا۔ محمود اُس وقت غزنین میں تھا۔ اُس نے بھائی کو لکھا کہ آپ بلخ کی حکومت کیجئے اور مجھے غزنین کا حاکم رہنے دیجئے۔ مگر اسمٰعیل نے نہ مانا۔ لڑائی چھڑی تو اسمٰعیل نے شکست کھائی اور محمود کی بادشاہی مسلم ہو گئی۔ اسے سامانی دربار سے سیف الدولہ کا خطاب مل چکا تھا۔ فتوحات ہندوستان وغیرہ کے بعد اثر اچھا خاصہ ہو گیا اور دربار خلافت سے یمین الدولہ و ولی امیر المومنین لقب ملا۔

محمود

اسکی ہمعصر سلطنتوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں جن میں سے ہر ایک

معاصرین

معاصرین کے یہاں بھی کمی نہ تھی۔ بعض کے حالات ملاحظہ ہوں:۔

ابوالفتح بستی

ابوالفتح بستی سلطان محمود کے باپ کے وقت سے دربار غزنین میں موجود تھا۔ اس کا عربی قصیدہ زیادۃ المرء فی الدنیا نقصان آج تک زبان زد ہے۔ فارسی اشعار بھی کہے ہیں مگر اس پایہ کے نہیں کہ عنصری وغیرہ کے مقابلے میں پیش کئے جائیں۔ یہی حال بیرونی اور بوعلی سینا وغیرہ کی شاعری کا ہے۔ بہترین رباعی شیخ الرئیس کی یہ ہے۔

بوعلی سینا کی رباعی

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت — یکموے ندانست ولے موے شگافت
اندر دل من ہزار خورشید بتافت — آخر بکمال ذرۂ راہ نیافت

دیکھنا کتنی موشگافی کی ہے اس فلسفیانہ خیال کے ظاہر کرنے میں کہ مظاہر کے پرتو پڑنا اور بات ہے اور کسی مظہر کی حقیقت سمجھنا اور بات! معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد۔ ارباب قال کی حد سے یہ نکتہ باہر ہے۔ اصحاب حال اس کی توضیح کریں گے۔

عنصری

عنصری۔ وہی بلخ کا مردم خیز خطہ جو بوعلی سینا کا ایسا حکیم اور مولانا روم کا ایسا عارف پیدا کرنے پر قادر ہے۔ سلطان محمود کی سلطنت شعر کا سرتاج بھی پیدا کرتا ہے۔ ابوالقاسم حسن بن احمد کو عنصری تخلص عطا کرکے نصر بن ناصر الدین سبکتگین کی خدمت میں پیش کیا۔ نصر نے اپنے بھائی محمود کے دربار میں تقریب کردی۔ پھر کیا تھا؟ کوکب اقبال چمک اٹھا۔ ملک الشعرا کا خطاب۔ چار سو زریں کمر غلام۔ دولت و مال غرض سب کچھ ملا۔ خاقانی کہتا ہے:۔

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان — ز زر ساخت آلات خوان عنصری

کہتے ہیں کہ اس کا آبائی پیشہ تجارت تھا۔ خود بھی تجارت کرنے

بھی کام لیا ہے چنانچہ ایک قصیدے میں سلطان محمود کے فتوحات و غزوات ۲۷ اشعروں میں نظم کئے ہیں۔ اشعار یہ ہیں :۔

شنیدہ خبرِ شاہ ہنداں جیپال ۔۔۔ کہ بہ سپہر بلندش ہمی بسود افسر

× × × × × × × × × ×

خدائگانِ خراساں بدشت پیشاور ۔۔۔ بہ حملۂ بہ پراگند آں ہمہ لشکر

حکایت سفرِ مولتاں ہمی دانی ۔۔۔ وگرنہ دانی تاج الفتوح پیش آور

اگر ز دجلہ فریدوں گذشت بے کشتی ۔۔۔ بہ شاہنامہ بآں بر حکایت است سمر

ازاں سپس کہ دو ہم را نبد پایاب ۔۔۔ وزاں سپس کہ بداں بادرانہ بود عبر

بہ مولتاں شد و در رہ دو بیست قلعہ کشاد ۔۔۔ کہ ہر یکے را صد بندہ بود چوں خیبر

اسی طرح اور قصائد میں بھی واقعہ نگاری کی ہے۔

(۳) صنائع و بدائع کو بھی اسی حد تک باریاب ہونے دیا ہے جتنے آرائش کلام کے لئے ضروری ہیں۔ متاخرین کی طرح سے حسن کلام کو ان زیوروں سے لاد کے بھدّا نہیں کر دیا :۔

تضاد — کہ آں آراستہ زلفش زرہ گردد گہی چنبر
کہ آں پیراستہ جعدش ببارد مشک وگہ عنبر

تشبیہ و ترصیع — رخی چوں نو شگفتہ گل ہمہ گلبن برنگ گل
ہمہ شمشاد پر سنبل ہمہ بیجادہ پر شکر

تضاد و ترصیع و تجنیس — زمن طاعت وزو فرماں ہمو رزق و ہمو حرماں
ہمو دردو ہمو درماں ہمو قدر و ہمو دادار

تنسیق الصفات و حسن تکرار — سمن بوئے شبہ موئے بلا جوئے جفا گوئے
پری زادے پری روئے پری چہرے پری پیکر الخ

عاشقانہ رنگ یہ ہے :-

ای شب نہ کنی اینہمہ پرخاش کہ دوش	راز دل من چنان مکن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم	ہاں ای شب وصل آنچنان باش کہ دوش

فرخی

فرخی - ابوالحسن علی بن قلوغ[1] سیستانی - ادب و موسیقی میں تعلیم پائی تھی اور چنگ خوب بجاتا تھا - ابتدا میں خلف بن احمد حاکم سیستان کے دربار میں رہا ضیق معاش نے مجبور کیا تو بلخ چلا گیا - ان دنوں یہاں کا امیر سلطان محمود کی طرف سے ابوالمظفر چغانی تھا - دارالحکومت میں پہونچکے معلوم ہوا کہ امیر داغگاہ میں ہے لیکن اُس کا مختار کل عمید اسعد موجود ہے - عمید کے پاس گیا تو اُسکی نظروں میں نہ سمایا - سمجھا کہ کوئی دیہاتی ہے - شاعری سے اسے کیا واسطہ مگر تہذیباً وعدہ کرلیا کہ امیر کے دربار میں حاضر کردونگا بشرطیکہ داغگاہ کی تعریف میں شعر کہہ لاؤ - نقشہ اُس کا بتادیا کہ کوسوں کا میدان ہوتا ہے - سبزہ زار اور چشمے جابجا نزہت افزائی کرتے ہیں گانا بجانا ہوتا ہے اور شراب کا دور چلتا ہے - امیر ایک ہاتھ میں پیالہ اور دوسرے میں کمند لیکے بیٹھتا ہے - شراب پیتا جاتا ہے اور لوگوں کو گھوڑے انعام میں دیتا ہے - رات بھر میں فرخی نے قصیدہ کہا جس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

چون پرند نیلگون بر روی پوشد مرغزار	پرنیان ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار
خاک را چون ناف آہو مشک زاید بی قیاس	بید را چون پر طوطی برگ روید بیشمار

× × × × × × × ×

داغگاہ شہریار اکنون چنان خرم شود	کاندرو از خرمی خیرہ بماند روزگار
سبزہ اندر سبزہ بینی چون سپہر اندر سپہر	خیمہ اندر خیمہ بینی چون حصار اندر حصار

---

[1] براؤن نے جاولغ لکھا ہے -

غیر مانوس بحروں میں بھی اشعار کہے ہیں اور اچھے کہے ہیں۔ تغزل کے خیالات وہی تشبیب میں ہیں یا رباعیوں میں جنکا ذکر بخوف طول ترک کیا جاتا ہے۔

عسجدی

عسجدی حکیم ابو نظر عبدالعزیز بن منصور مروزی بھی اسی زمانے کے فحول شعرا میں ہے۔ سلطان محمود کے دربار میں اسکی بھی کرسی تھی اور انعامات وجائزات بہت پائے تھے۔ ۴۳۲ھ سال وفات ہے۔ صاحب مجمع الفصحا کہتے ہیں کہ "زر کلامش بر محک اہل کمال کامل عیار و بے غل وغش شدہ"۔ دولت شاہ وغیرہ نے صرف ایک رباعی اسکی نقل کی ہے:۔

از شرب مدام لاف مشرب توبہ　　وز عشق بتان سیم غبغب توبہ
دل در ہوس گناہ و برلب توبہ　　زیں توبۂ نادراست یارب توبہ

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبیعت میں شوخی خاص طور پر تھی ایک قصیدے میں ساقی کو قبلۂ زردشت کہا ہے۔ بیحد شوخ اختراع ہے۔

برخیز و برافروز ہلا قبلۂ زردشت　　بنشین و برافگن شکم قاقم بر پشت
بس کس کہ ز زردشت بگردید و دگر بار　　ناچار کند روے سوے قبلۂ زردشت

+ + + + + + + +

آنکس کہ ترا کشت ترا کشت و مرا زاد　　وانکس کہ ترا زاد ترا زاد و مرا کشت الخ

حسن تکرار کے چند شعر یہ ہیں:۔

باران قطرہ قطرہ ہمی بارم ابر وار　　ہر روز خیرہ خیرہ ازیں چشم سیل بار
اعلان نون

زاں قطرہ قطرہ قطرۂ باران شدہ خجل　　زاں خیرہ خیرہ خیرہ دل من ز ہجر یار

یاریکہ ذرہ ذرہ نماید ہمی نظر　　ہجرانش بارہ بارہ بمن بر نہادہ بار

زاں ذرہ ذرہ ذرہ بدل آمدم چو کوہ　　زاں بارہ بارہ بارہ بچشم آمدم غبار الخ

نہ ہوا بلکہ جواب میں لکھ بھیجا :-

بگوش از سرِ وشم بسے مژدہاست ۔۔۔ دلم گنج گوہر زباں اژدہاست

چہ سنجد بمیزان من عنصری ۔۔۔ گیا چوں کشد پیش گلبن سری

غرض غزنین میں آ کے پہلے ایک باغ میں ٹھرا۔ وہاں عنصری۔ فرخی اور عسجدی بھی سیر کرنے آئے تھے۔ یہ درباری تکلفات کے دل دادہ۔ فردوسی دامن صحرا کا تربیت یافتہ۔ پہلے یہ لوگ ہنسے اور کہا کہ یہاں سوائے شاعر کے کوئی نہیں ٹھر سکتا۔ فردوسی نے کہا کہ میں بھی شعر کہتا ہوں۔ چاہو امتحان لے لو۔ سب ہنس پڑے اور کہا کہ اچھا آؤ۔ ہم سب ایک ایک مصرع کہتے ہیں۔ تم بھی کہو :-

عنصری ۔۔۔ چوں عارض تو ماہ نباشد روشن

فرخی ۔۔۔ مانند رخت گل نبود در گلشن

عسجدی ۔۔۔ مژگانت ہمی کند گزار از جوشن

شین کا التزام تھا۔ شگفتہ قافیہ کہاں سے ملتا؟ فردوسی نے کہا :-

مانند سنانِ گیو در جنگ پشن

اب روایتیں مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ عنصری خوش ہو گیا اور دربار میں لے گیا۔ کسی کا بیان ہے کہ ماہک سے دوستی ہو گئی اس نے فضل بن احمد وزیر سے ذکر کیا اور وزیر بادشاہ کے پاس لے گیا۔ غرض فردوسی نے اپنے اشعار سنائے تو بادشاہ اور اہل دربار سب محو حیرت ہو گئے۔ ابتدا بادشاہ کی تعریف سے کی :-

ز یزدان ابر شاہ باد آفریں ۔۔۔ کہ نازد باو تخت و تاج و نگیں

جہان آفرین تا جہاں آفرید ۔۔۔ چو او مرزبانے نیامد پدید

وہ روپیہ وہیں سب لٹا کے کہلا بھیجا کہ میں نے یہ خونِ جگر سفید دانوں
کے لئے نہیں کھایا تھا۔" جب محمود نے سنا تو دراندازوں پر خفا ہوا کہ
تم نے مجھے بدنام کیا۔ مگر اُن لوگوں نے کہا کہ فردوسی نے گستاخی کی۔ اگر بادشاہ
خاک بھی دیتا تو اسے آنکھوں پر رکھنا تھا۔ بادشاہ اور جل گیا اور کہا کہ
اس قرمطی کو گستاخی کا مزا چکھاؤں گا۔ صبح کو محمود باغ میں گیا تو
فردوسی پاؤں پر گر پڑا اور کہنے لگا:۔

چو در ملک سلطان کہ چرخش ستود — بسے ہست ترسا و گبر و یہود
گرفتند در ظل عدلش قرار — شدہ ایمن از گردش روزگار
چہ باشد کہ سلطانِ گردوں شکوہ — بہ من را شمارد ازاں یک گروہ

بادشاہ کو رحم آگیا اور تقصیر معاف کر دی۔ اب فردوسی غزنین سے
بھاگا اور چلتے وقت ایاز کو ایک لفافہ دے گیا کہ بیس روز کے بعد
بادشاہ کو دینا۔ محمود نے جو مہر کھولی تو ہجو کے اشعار تھے۔ کلام کی
قوت دیکھو کہ محمود نے بڑی بڑی سلطنتیں مٹا دیں مگر یہ ہجو نہ مٹا سکا اور
آج تک شاہنامے کے ابتدا میں درج ہوتی ہے۔ بدنصیب شاعر
بھاگ کے ہرات پہونچا تو شاہی جاسوس تعاقب میں پہونچے۔ چھ ماہ
روپوش رہا۔ پھر طوس گیا اور وہاں سے قہستان پہونچا جہاں کے حاکم
نے ہجو کے اشعار بحساب فی شعر ایک اشرفی مول لئے اور کہا کہ اسے
شاہنامے سے مٹا دو۔ فردوسی نے ایسا ہی کیا مگر وہ مشہور ہو چکی تھی
اور زبان زد ہونے کی وجہ سے مٹنا دشوار ہو گیا۔ ناصر الملک نے محمود کو پھر لکھ
بھیجا کہ فردوسی کے حق میں بڑا ظلم ہوا۔ فردوسی جب غزنین سے چلا تھا تو جامع مسجد پر یہ شعر لکھ آیا تھا۔[1]

---
[1] دیکھو صفحہ ۴۹

اور خود بھی انھیں خیالات کی پیروی کرتا تھا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ
فردوسی بہشت میں نہایت شان سے ہے۔ پوچھا کہ تیری مغفرت کیونکر
ہوئی کہا اس شعر کی بدولت :-

جہاں را بلندی و پستی توئی — ندانم چہٖ ہر چہ ہستی توئی

سال وفات ۴۱۱ھ ہے۔ صاحب مجمع الفصحا نے ۴۶۱ھ لکھا
ہے۔ معلوم نہیں اتنا اختلاف کیوں ہے۔ حالانکہ فردوسی نے ختم
شاہنامہ کی تاریخ خود لکھی ہے :-

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار — کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

شاہنامہ کی تاریخی حیثیت

یعنے سنہ ۴۰۰ھ میں شاہنامہ ختم ہوا۔ اسکے بعد چند ہی سال زندہ رہا۔
۴۱۱ھ تک بھی بہت زائد زمانہ ہوتا ہے نہ کہ ۴۶۱ھ۔

فردوسی کی تصانیف میں **شاہنامہ** اور **یوسف زلیخا** ہیں اور کچھ
غزلیہ اشعار و قطعات وغیرہ لیکن جس تصنیف نے اسے "خدائے سخن"
کا لقب دلایا ہے وہ شاہنامہ ہے جو تیس برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔
تاریخی حیثیت اسکی اتنی مضبوط ہے کہ پروفیسر براؤن بہت کچھ تحقیق کرنے
کے بعد کہتے ہیں کہ "ہماری نظر میں اسکی وقعت یہ دیکھ کے بڑھ جاتی ہے
کہ جن کتابوں سے اس نے شاہنامہ لکھا ہے ان سے ترتیب وار
مطابقت پائی جاتی ہے"۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاہنامہ کا ماخذ کیا ہے؟
مجمع الفصحا سے معلوم ہوتا ہے کہ جاماسپ نامہ۔ آئین بہمن۔ دلداب نامہ
دانش افزائے نوشیروانی۔ پاستان نامہ۔ دانشور نامہ۔ خرد نامہ وغیرہ
کا وجود فردوسی کے زمانے میں تھا اور ان کتابوں سے اس نے پوری
مدد لی ہے۔ علاوہ بریں خلفائے بنی امیہ و بنی عباس کے عہد میں

یکے پہلوان بود دہقان نژاد   دلیر و بزرگ و خردمند و راد
ز ہر کشورے موبدے سالخورد   بیاورد و ایں نامہ را گرد کرد
بپرسید شاں از نژاد کیاں   وزاں نامداران فرخ گواں
بگفتند پیشش یکایک جہاں   سخنہائے شاہان و گشت جہاں
چو بشنید ازیشاں سپہبد سخن   یکے نامور نامہ افگند بن

یہ کتاب دو ہزار برس کی تصنیف تھی اور اسی پر شاہنامہ کے افسانوں کی اکثر بنیاد تھی۔ اسکے علاوہ اور ماخذ بھی ہیں جن کا حوالہ فردوسی برابر دیتا ہے مثلاً شغاد کی داستان کے متعلق لکھا ہے :-

یکے پیر بد نامش آزاد سرو   کہ با احمد سہل بودے بمرو
کجا نامۂ خسرواں داشتے   تن و پیکر پہلواں داشتے
بہ سام نریماں کشیدش نژاد   بسے داشتے رزم رستم بیاد
بگویم سخن آنچہ زو یافتم   سخن را یک اندر دگر بافتم

اسی طرح بیژن اور طلحند وغیرہ کی داستانوں کے حوالے بھی ذکر کئے ہیں اور اگر کسی زمانے کی تاریخ نہیں ملی ہے تو صاف صاف لکھ دیا ہے۔ مثلاً اشکانیوں کی طوائف الملوکی کا ذکر کرتا ہے۔

از ایں گونہ بگذشت سالے دویست   تو گفتی کہ اندر جہاں شاہ نیست
چو کوتاہ شد شاخ و ہم بیخ شاں   نگوید جہاں دیدہ تاریخ شاں
از ایشاں جز از نام نشنیدہ ام   نہ در نامۂ خسرواں دیدہ ام

تاریخی ایمانداری کا اتنا خیال ہے کہ ہر واقعہ جتنا ملتا ہے اتنا ہی لکھتا ہے۔

گر از داستاں یک سخن کم بُدے   روان مرا جائے ماتم بُدے

مسئلہ ہے کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے اسلئے ہم نے یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا"۔ بعض محققین کہتے ہیں کہ سیمرغ اور دیو سفید وغیرہ کے بے سرو پا افسانے درج ہونے کی وجہ سے یہ کتاب پایۂ اعتبار سے ساقط ہے مگر فردوسی کو وہی مجبوری ہے جو ہیرودوتوس اور ثعلبی ایسے جلیل القدر مورخوں کو پیش آئی ان افسانوں کا قوم میں مشہور ہونا متقاضی تھا کہ ضرور نقل کر دئے جائیں۔

شاہنامہ کے علمی فوائد

علاوہ تاریخ مجسم ہونے کے شاہنامہ کی مسلسل نظم سے مختلف زمانوں کے سیاسی اور تمدنی حالات خوب معلوم ہوتے ہیں اور قواعد معاشرت وعقائد مذہبی کی تصویریں اکثر ملتی ہیں کہیں معلوم ہوتا ہے کہ موبدوں کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔ کہیں پتہ لگتا ہے کہ ایرانی لوگ ظالم کے خاندان میں حکومت باقی نہیں رکھتے تھے۔ بعض مقامات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ تخت نشینی کے وقت کھڑے ہو کر تقریر کرتا تھا اور اپنے اصول حکومت ظاہر کر دیتا تھا۔ اسی طرح دربار میں بادشاہ کا مقام امراو حجاب کے مقامات وفرائض وغیرہ وغیرہ سب ملتے ہیں۔ مولانا شبلی نے خوب فرمایا ہے کہ ان اعتبارات سے شاہنامہ ایران کا انسائکلوپیڈیا ہے۔

فردوسی کی وقعت

شاعری کی حیثیت سے فردوسی کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ "خدائے سخن" مانا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے:۔

سکہ کاندر سخن فردوسی طوسی نشاند
کافرم گر ہیچکس از جملۂ فرسی نشاند
اول از بالائے کرسی بر زمیں آمد سخن
او دگر دستش گرفت و بر سر کرسی نشاند

مسئلہ ہے کہ گھر کا حال گھر والا خوب جانتا ہے اسلئے ہم نے یونانیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کا زیادہ اعتبار کیا۔" بعض محققین کہتے ہیں کہ سیمرغ اور دیو سفید وغیرہ کے بے سروپا افسانے درج ہونے کی وجہ سے یہ کتاب پایۂ اعتبار سے ساقط ہے مگر فردوسی کو وہی مجبوری ہے جو ہیرودوتوس اور ثعلبی ایسے جلیل القدر مورخوں کو پیش آئی ان افسانوں کا قوم میں مشہور ہونا متقاضی تھا کہ ضرور نقل کر دئے جائیں۔

شاہنامہ کے علمی فوائد

علاوہ تاریخ مجسم ہونے کے شاہنامہ کی مسلسل نظم سے مختلف زمانوں کے سیاسی اور تمدنی حالات خوب معلوم ہوتے ہیں اور قواعد معاشرت وعقائد مذہبی کی تصویریں اکثر ملتی ہیں۔ کہیں معلوم ہوتا ہے کہ موبدوں کی رائے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا تھا۔ کہیں پتہ لگتا ہے کہ ایرانی لوگ ظالم کے خاندان میں حکومت باقی نہیں رکھتے تھے۔ بعض مقامات پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ تخت نشینی کے وقت کھڑے ہوکر تقریر کرتا تھا اور اپنے اصول حکومت ظاہر کر دیتا تھا۔ اسی طرح دربار میں بادشاہ کا مقام امراء و حجاب کے مقامات و فرائض وغیرہ وغیرہ سب ملتے ہیں۔ مولانا شبلی نے خوب فرمایا ہے کہ ان اعتبارات سے شاہنامہ ایران کا انسائکلوپیڈیا ہے۔

فردوسی کی وقعت

شاعری کی حیثیت سے فردوسی کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ "خدائے سخن" مانا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے:۔

سکۂ کاندر سخن فردوسی طوسی نشاند
کافرم گر ہیچکس از جملۂ فرسی نشاند
اول از بالائے کرسی بر زمیں آمد سخن
او دگر دستش گرفت و برسر کرسی نشاند

کہ راہ ہم چشمی او بسنجد بلکہ احدے نبود کہ سر از ربقۂ شاگردی او بہ پیچد" اور آجکل صاحب مجمع الفصحاے ناصری نے لکھا ہے کہ "تا ایں غایت شعرائے عجم در نظم پارسی کتابے مانند شاہنامہ و مثنوی مولوی در عالم بیادگار نہ گذاشتہ اند" واہل البیت اعرف بما فی البیت۔ تعجب ہے کہ پروفیسر براؤن کی نظر میں شاہنامہ کی شاعری سکندر نامہ سے پست ہے حالانکہ مذاق سلیم کا حکم تقابل کے بعد یہی ہے کہ شاہنامہ کہیں بلند ہے اور بقول مولانا شبلی دونوں میں قطرہ اور دریا کی نسبت ہے۔

شاہنامہ کے خصوصیات

تنقیدی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہنامہ نے فارسی زبان میں روح پھونک دی ہے اور اس قابل بنا دیا ہے کہ یہ زبان دوسری قوموں کی نظر میں باوقعت ہو سکے۔ بعض خصوصیات صوری و معنوی حسب ذیل ہیں:۔

(ا) شاہنامہ عربی زبان کی کشمکش سے بچنا چاہتا ہے۔ بہت بڑا تغیر فارسی پر اسلام کے غلبے سے یہ ہوا تھا کہ عربی الفاظ زبان میں بکثرت داخل ہو گئے تھے۔ رودکی وغیرہ کے کلام سے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہو گا کہ اسی وقت عربی اتنی خلط ملط ہو گئی تھی کہ زبان کی جزو مستقل معلوم ہوتی تھی۔ دقیقی پہلا شخص ہے جس نے پرانی فارسی کے الفاظ واپس لانے کی کوشش کی مگر کسی قدر آورد کے ساتھ۔ فردوسی نے فصاحت [illegible] مروجہ کو باقی رکھکے یہ خصوصیت برتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی اپنی زبان کو دری کہتا ہے کبھی پہلوی کہتا ہے۔ اصطلاحات علمیہ بھی حتی الوسع فارسی زبان کے لاتا ہے اور آمد کے ساتھ:۔

از آغاز باید کہ دانی درست	سرمایۂ گوہراں از نخست
ماده	عناصر	ازل

برو بر نہادہ نگونسار زیں   ز زیں اندر آویختہ گرز کیں

ہماں نامور خود و خفتان اوی   ہماں ترکش و مغفر جنگجوی

(۳) حسن و عشق کے بیان میں نہایت متین ہے جامی و نظامی کی طرح حد سے باہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بزم کے بیان میں بھی اعتدال پسند ہے۔ یہ اسلام کی شجاعت و ملک گیری کے زمانے کا شاعر ہے۔ سوز و گداز، نالہ و فریاد کی ادائیں کیا جانے۔ اسکے ہیرو بھی اسی نقش کے ہیں۔ دل دینا اور بات ہے اور مٹ جانا اور بات ہے۔ سہراب کے ایک حریف کے چہرے سے میدان جنگ میں جھلم ہٹ گئی۔ دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت ہے۔ یہ فریفتہ ہو گیا۔ وہ دھوکا دیکے نکل گئی۔ ہجر کا درد ہوا۔ نالوں کا وقت آیا مگر کیونکر:۔

ہمی گفت ازاں پس دریغا دریغ   کہ شد ماہ تابندہ در زیر میغ (ابر)

غریب آہوے آمدم در کمند (میری کمند میں آیا)   کہ از بند جست و مرا کرد بند

زہی چشم بندی (شعبدہ) کہ آں پر فسوں   بہ تیغم نخست و مرا ریخت خوں (زخمی نہ کرد)

ندانم چہ کرد آں فسونگر بمن   کہ ناگہ مرا بست راہ سخن

بزاری مرا خود بباید گریست   کہ دلدار خود را ندانم کیست

(۴) ایجاز و اختصار سے بھی کبھی کبھی علم بلاغت کی داد دیتا ہے۔ اور جتلاتا ہے کہ صاحب ذوق سلیم اختصار کے ذریعے سے کلام میں وہ زور پیدا کرتا ہے جو تفصیل میں ممکن نہیں:۔

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو   دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

جنگ کی حالت میں ایکبار شورے کی ضرورت ہوئی۔ لڑائی کی گھما ن

بروز نبرد آں یلِ ارجمند | بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
بُرید و درید و شکست و ببست | یلاں را سر و سینہ و پا و دست

دیکھو کس شان سے معرکۂ قتال کی تصویر کھینچی ہے اور آلات حرب کا برمحل استعمال کس اطمینان قلب اور چابک دستی کا مرقع دکھاتا ہے۔ علمائے بدیع نے اس کا نام لف و نشر رکھدیا اور اتنا ہی نظر آسکا۔ مدرسے میں چلکے سُنائی دیگا کہ یہ اشعار لف و نشر کی مثال ہیں۔ ذرا غور سے دیکھو کیا اتنی ہی بات ہے یا کچھ اور بھی ہے۔ یا

فرو شد بہ ماہی و برشد بہ ماہ | بُنِ نیزہ و قبۂ بارگاہ
زبس گرد میداں کہ برشد بہ دشت | زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

ذرا انصاف سے کہنا کہ صنعت لف و نشر مرتب اور مبالغہ کہدینے سے ان شعروں کی خوبی ختم ہوگئی یا میدان کارزار کے دیکھنے والوں کی جلالت سے متاثر اور رستخیز سے متحیر دلوں کا نقشہ ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مظفر و منصور فوج کی عظمت و جلالت کا اثر تحت الثریٰ سے لیکے فوق السما تک ہے۔ اور ہنگامہ اس بلا کا کہ زمین کے طبقے اُڑتے نظر آتے ہیں۔ اس گھبراہٹ میں خدا جانے دیکھنے والے کے دماغ میں کیا کیا خیالات پیدا ہو رہے ہیں اور قوت متخیلہ اُن کی تصویریں آنکھوں کے سامنے کس کس رنگ میں پیش کر رہی ہے،

(۹) پُرانی زبان کے باقیات صالحات کی غالباً آخری جلوہ گاہ ہے۔ مردہ محاورات و الفاظ کو زندگی کا عاریتی جامہ پہنا کے میدان سخن میں گلگشت کا موقع دیا گیا ہے۔ لیکن یہ حیات مستعار فردوسی کی زندگانی سے وابستہ ہے۔ خدائے سخن کے بعد ان کا عالم کون و فساد میں باقی رہنا محال ہوگیا۔ نہ اسم و فعل کے بعد الف زائد دکھائی دینگے۔ نہ ہر جگہ الف و

لحاظ رکھتا ہے۔ ایک کے یہاں جوشِ جوانی دوسرے کے یہاں تجربہ کاری ہر مقام سے مترشح ہے **بہرام گور** اور **منذر** سے جو مکالمہ ہوا ہے اُس سے عرب و عجم کے طرزِ معاشرت اور عنفوانِ تخیّل کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔ **افراسیاب** زور و ظلم کا کیرکٹر ہے **ضحاک** بد طینتی اور ظلم کا ہیرو ہے **کیکاؤس** میں عظمت و شجاعت کے ساتھ ساتھ راج ہٹ اور کسی قدر کینہ پروری موجود ہے **کیخسرو** میں اخلاقِ حمیدہ کا توفر ہے اور عظمتِ ایران کا کامل جلوہ۔

(۸) قوانینِ حکمت اخلاق کا مخزن وہ مواعظ ہیں جو بطور استطراد آجاتے ہیں۔ فلسفۂ مذہب پر آزادانہ نظر ہے۔ حق کا جلوہ سب میں ہے۔ صنم سے صمد تک تھوڑا راستہ ہے۔ **سیلن دخت** یہی بات سام سے کہتی ہے:۔

خداوندما و شما خود یکیست	بہ یزدانِ ما ہیچ بیکار نیست
گذشتہ از و قبلۂ ما بت است	چہ در چین و کابل چہ در ہندوست[۱]
شمارا خورد آتشِ پُر فروغ	توانی کزیں در نگفتم دروغ
پرستیدنِ ہر دو راہِ بد است	چو مارا ہمہ آرزو ایزد است[۳]

اُس کے علاوہ یہ بھی مناسب ہے | کہ اس مبحث پہ

سیاسیات و اقتصادیات کے مسائل بھی الٰہیات سے کم نہیں پھر **بلاغت** کی یہ حالت ہے کہ جس مسئلے کا ذکر کرتا ہے مقتضائے حال کو نظر انداز ہونے نہیں دیتا۔ موبدوں کی طرزِ ادا اور ہے پہلوانوں کی اور مضامینِ عشقیہ

---

[۱] جن ممالک کے نام لئے ہیں وہ سب زمانۂ قدیم میں بت پرست تھے۔ محض ضرورتِ شعر سے چند نام بے سمجھے بوجھے نظم نہیں کئے ہیں۔

[۲] معلوم ہوتا ہے کہ آتش پرستی کیانیوں سے بھی پیشتر تھی۔ گشتاسب کی حیثیت مجدّدِ مذہب کی ہے۔

[۳] فلسفیانہ نظر اور مذاقِ کلامی کا نمونہ۔

کافی اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مناظرۂ شب و روز۔ مناظرۂ زمین و آسمان۔ مناظرۂ گبر و مسلم۔ مناظرۂ قوس درمح مجمع الفصحا میں درج ہیں۔ ان میں سے ایک منوچہر بن قابوس کی تعریف میں بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیاریوں کے دربار میں بھی گیا تھا سلطان محمود کے سبعۂ سیارہ میں اس کا بھی شمار ہے اور براؤن کی روایت ہے کہ مناظرہ عرب و عجم میں شمس الدولہ اور مجد الدولہ سلاطین آل بویہ کی مدح کی وجہ سے محمود اس سے ناراض ہو گیا تھا۔ وفات سلطان مسعود بن محمود کے زمانے میں ہوئی ہے۔ علاوہ گرشاسپ نامہ اور مناظرات کے ایک لغت عجم بھی اس کی یادگار ہے۔

مناظرات میں قوت تخیل کا زور ہے اور معلومات علمیہ کے اظہار کا ایک نیا راستہ نکالا گیا ہے۔ اگرچہ سوال و جواب کا طریقہ عنصری نے ایجاد کیا ہے لیکن وہ گفتگو ے محض تھی اور یہ مخالف کے مقابلے میں اپنی فضیلت ثابت کرتا ہے۔

کردست در مراتب ہستی خدائے ما ؎ ہر سان شگفت بیحد از ارض تا سما (طرح عجائب)

نتوان شمرد این دو کہ فضل کدام بیش ؎ کاندر شمار ہشان نتوان یافت انتہا

اندر حکایت است کہ ہر دو براگہی ؎ بد در سخن جدل زرہ فخر و کبریا

گفت آسمان نخال مرا جملہ حکمت است ؎ وز حکمت است در حکما حکمت و ذکا

گفتش زمین کہ قحط وہ با ہم ز تو بود ؎ چہ حکمت است قحط و برآوردن وبا

گفت آسمان مرا ز تو ہیبت فزون ازانک ؎ بر تیر ہم اژدہاست میان شیر با بلا

گفتش زمین کہ بیست ترا اژدہا و شیر ؎ بیش است صد ہزار مرا شیر و اژدہا

گفت آسمان ز قدرت جبار من مدام ؎ گردندہ ام معلق و بے جائے و اتکا

گفتش زمین اگر تو بہ گردش معلقی ؎ من نیز ہم معلقم استادہ در ہوا الخ

لہ ان اشعار میں جن الفاظ پر — نشان بنا ہے وہ بیراتی زبان کے ہیں۔

دولت سامانیہ کی طرف سے حاکم خراسان تھا۔ آخر سلطان محمود نے اسے گرفتار کر لیا اور خود خراسان کا مالک ہو گیا۔ سنجور کے حکم سے سنجری آل سبکتگین کی ہجو کرتا تھا۔ محمود نے اسے بھی گرفتار کرایا مگر عنصری نے سفارش کی اور خطا معاف ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ عنصری اس کا شاگرد بھی تھا اور استاد نے شاگرد کی تعریف میں قصائد کہے اور بہت سا مال حاصل کیا۔ سنہ ۴۲۰ھ کے بعد انتقال ہوا کلام کمیاب ہے۔

پندار رازی

پندار رازی۔ خواجہ کمال الدین نام۔ امیر مجد الدولہ دیلمی اور اس کے وزیر صاحب بن عباد کے دربار کا حاضر باش ہے اور رہا۔ انھیں امرا کی مدح گستری میں وقت صرف کیا۔ دیلمی۔ عربی۔ فارسی زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ سنہ ۴۲۰ھ میں وفات پائی اور مجد الدولہ بھی اسی سال مقتول ہوا۔ کلام کمیاب ہے اور یہ قطعہ یادگار:۔

از مرگ حذر کردن دو روز روا نیست

روزیکہ قضا باشد و روزیکہ قضا نیست

روزیکہ قضا باشد چیزے نکند سود

روزیکہ قضا نیست درو مرگ روا نیست

منوچہری

منوچہری۔ حکیم ابو النجم احمد دامغانی۔ علوم و آداب ختم کرنے کے بعد عنفوان شباب میں امیر منوچہر بن قابوس کی خدمت میں باریاب ہوا اور اسی کے نام پر تخلص رکھا۔ اس زمانے میں قادر باللہ عباسی کی خلافت تھی مگر سلطان محمود کا اتنا جاہ و جلال تھا کہ امیر منوچہر کو بچاس ہزار دینار سلطان غزنین کو سالانہ پیشکش کرنا ہوتے تھے۔ منوچہر کو وفاداری کے صلے میں سلطان کی دامادی کا شرف حاصل ہوا۔ ۴۱۱ھ میں اس امیر

ولہ

امرؤالقیس[1] و لبید و اخطل و اعشی و قیس
طفیل با تو چہ کردند وے ویر کم تلی
آنکہ گفت آذنتنا[2] آنکہ گفت الا ھبی[3]
آنکہ گفت السیف اصدق[4] آنکہ گفت بلی الہوی[5]

کلام عرب کے تلمیحات وغیرہ بھی اسی وجہ سے اسکے کلام میں بکثرت آگئے ہیں بلکہ بعض قصیدوں کی تشبیہیں بالکل عربی مذاق کی ہیں اور تخییل تک عرب کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ زبان کی شیرینی اور فصاحت و لطافت نے اور بھی دل آویزی پیدا کردی ہے:۔

اے ترک من امروز نگوئی کہ کجائی | تاکس بفرستیم و بخوانیم و بیائی
آنکس کہ نباید بر ما زود تر آید | تو دیر ترآئی بہ بر ما کہ بیائی
وانروز کہ من شیفتہ تر باشم بر تو | عذرے بنہی بر خود و نازے بفزائی
گوئی بہ رخ کس منگر جز بہ رخ من | اے ترک چنین شیفتۂ خویش چرائی
من در دگران زان نگرم تا بحقیقت | قدر تو بدانم کہ ز خوبی بچہ جائی

مناظر قدرت کا مرقع بھی خوب کھینچتا ہے۔ خزانیہ مسمط سلطان مسعود غزنوی کی مدح میں نظم کرتا ہے:۔

(۱)

خیزید و خز آرید کہ ایام خزانست
باد خنک از جانب خوارزم وزانست

---

[1] شعرائے عرب کے نام۔ [2] حارث بن حلزہ [3] عمرو بن کلثوم
[4] ابو تمام۔ [5] متنبی۔

کہتا ہے :-

بگردا یہ چراغِ نیم مردہ　　　　کہ ہر ساعت فزوں گردوش روغن

ہلال دیکھ کے خیال آتا ہے کہ کسی معشوق نے اپنے سونے کے کڑے کا منہ کھول دیا ہے :-

چناں چوں دو سرازہم باز کردہ　　　　ز زرّ سرخ یک دست آورنجن
کڑا

لغزیات بھی یادگار ہیں شمع کے متعلق کہتا ہے :-

چیست آن شخصے چو زرّین سرد چوں سیمین چمن
خویشتن سوزان و گریان و گدازان ہمچو سن
باغ او بزم سلاطین جائے او صدر شہان
بار او زرّیں سلاسل بیخ او سیمیں لگن
خیز زاں رنگست اگر نورست رنگِ خیز راں
نارون بار است اگر نار است بار نارون
ہر کسے دارد دہن بر روی او دارد بفرق
واندرو نجم فروزان چوں سہیل اندر یمن
الخ

خاتمہ

دورۂ غزنویہ کو یہاں پر ختم کر دینا مناسب ہے اگرچہ ابھی بہت سے شعراء مصنفین کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ مثلاً بہرامی سرخسی مصنف خجستہ نامہ و غایت العروضیین و کنز القافیہ یا لبیبی - امینی - ابوالفضل طالقانی - منشوری - عطاردی - زینت علوی محمودی وغیرہ اور خصوصاً کسائی مروزی جس کا نشو و نما آل سامان کے زمانے میں ہو چکا تھا بلکہ اسنے نوح بن منصور سامانی کا مرثیہ بھی کہا ہے :-

جنازۂ تو ندانم کدام حادثہ بود　　　　کہ دیدہا ہمہ مصقول ماند وریخ مجروح

باب ہفتم

سلجوقیہ

اس خاندان کا عروج دنیائے اسلام میں غزنویوں سے جلد تر ہوا۔ ابن اثیر نے مورث اعلیٰ کا نام تقاق بتایا ہے جس کا بیٹا سلجوق مسلمان ہو گیا۔ گرمیوں کے موسم میں سمرقند ان کا مستقر تھا اور جاڑوں میں بخارا۔ غالباً حافظ شیرازی اپنے معشوق کو ہر موسم میں بہترین مقام دینا چاہتے ہیں بلکہ ہر فصل کی دارالسلطنت ترکوں کی دے دیتے ہیں تاکہ ہمیشہ معشوق ہی کی حکومت رہے۔

سلجوق

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

اس خاندان کا شجرہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے:-

سلجوق

- اسرائیل (سات برس سلطان محمود کے قید خانے میں رہا)
  - قتلمش (قید خانے سے فرار کر کے بخارا گیا)
- میکائیل
  - طغرل سلطان اول
  - جغری داؤد (حاکم مرو)
    - قاورت (سلاجقۂ کرمان کا مورث اور حاکم کرمان)
    - یاقوتی (حاکم آذربائیجان و کرجستان)
    - الپ ارسلان سلطان دوم (دارالسلطنت رے)
      - تتش
      - ایاز
      - تکش
      - ارسلان ارغون
      - ملک شاہ
        - برکیارق
        - محمد
        - سنجر
        - محمود
      - زوجۂ مقتدر عباسی
    - ارسلان خاتون خدیجہ زوجۂ قائم بامر اللہ عباسی
- یونس
- موسیٰ یا ارسلان بیغو (حاکم بست و ہرات و سیستان)
  - قتلمش (سلاجقۂ روم کا مورث اعلیٰ اور حاکم کرمان و واخان)

محمود غزنوی کی طلب پر یہ لوگ بخارا میں آباد ہوئے تھے مگر ان کی روز افزوں قوت

---

[1] ایشیائے کوچک مراد ہے ۔ ۱۲

چرچا ہو گیا۔ الپ ارسلاں کی سلطنت کا زمانہ صرف نو برس ہے مگر اس عرصے میں بہت سے کارنامے ظاہر ہوئے خلفائے بنی فاطمہ کا اقتدار افریقہ میں جبل الطارق کے حدود سے لیکے مصر تک تھا اور ایشیائے کوچک سے مکہ معظمہ و مدینہ منورہ تک۔ انکا اثر حرمین شریفین اور حلب سے اس نے مٹا دیا اور دیوجانس قیصر روم کو بھی ایک جنگ میں قید کر لیا مگر آخر میں اپنا باجگذار بنا کے جان بخشی کر دی۔ سنہ ۴۶۵ھ میں دریائے سیحون کے اُس پار ترکوں سے ایک جنگ عظیم میں مصروف ہوا۔ وہاں ایک شخص نے بھرے دربار میں سلطان کو زخمی کیا یہ زخم مہلک ثابت ہوا اور چند روز کے بعد انتقال کر گیا اور مرو میں دفن کیا گیا۔ ایک شاعر نے کہا ہے :۔

سر الپ ارسلاں دیدی ز رفعت رفتہ بر گردوں　　بمرو آتا بخاک اندر سر الپ ارسلاں بینی

ملک شاہ و نظام الملک

بعد ازاں ملک شاہ اُس کا بھتیجا سترہ برس کی عمر میں وارث سلطنت ہوا۔ اس کا ابتدائی زمانہ نہایت نازک تھا۔ علاوہ امرائے غزنین و سمرقند کے خود قاورت اسکے چچا نے بغاوت کی مگر نظام الملک کی حکمت عملی سے سب کے سب زیر ہو گئے عمر خیام نے اسی عہد میں عروج حاصل کیا اور رصد خانہ ملک شاہی اور زیچ ملک شاہی تیار کی جو علم ہندسہ کے بہترین کارنامے ہیں۔ ابوطاہر خاتونی نے مناقب الشعرا اسی عہد میں لکھی جو اب نایاب ہے۔ ملک شاہ دو مرتبہ اپنی عہد حکومت میں بغداد گیا اور خلیفۂ وقت نے بیحد عزت کی۔ سرحد چین سے عدن تک اور کاشغر و ماوراء النہر سے بلاد روم تک اس کی حکومت کا ڈنکا بجتا تھا اور حق یہی ہے کہ اتنی وسیع سلطنت آل سلجوق کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ آخر عہد میں ترکان خاتون کے بھڑکانے سے ملک شاہ کو نظام الملک سے عداوت ہو گئی اور اُسے معزول کر کے ابو الغنائم تاج الملک کو وزیر کیا۔ نظام الملک کو اس ناقدری پر افسردہ خاطری پیدا ہو گئی اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد رمضان ۴۸۵ھ میں بمقام نہاوند مقتول ہوا اور چالیس روز کے بعد

چودہ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا مگر حماقت میں آ کے اپنے چچا سنجر سے لڑ گیا نتیجہ اس جنگ کا بجز شکست کے اور کیا ہو سکتا تھا مگر سنجر نے اسکی خطا معاف کر دی اور عراق کا حاکم کر دیا جہاں چودہ برس اُس نے حکومت کی اور آخر میں سلطان سنجر کا داماد بھی ہو گیا۔

سنجر

۵۱۱ھ میں سلطان سنجر کی سلطنت کا اعلان بغداد میں ہو گیا جس نے باوجود زحمت اور کوفت کے اکتالیس سال سلطنت کی علوم و فنون کی ترویج کے لئے یہ عہد تاریخ عجم میں یادگار ہے۔ امیر معزی۔ ارزقی۔ انوری۔ سوزنی وغیرہ شعرائے جلیل القدر اس دور کی یادگار ہیں۔ طوسی طبری۔ نسفی و شہرستانی وغیرہ کے مصنّفات عربی میں اسی عہد میں شائع ہوئے۔ مقامات حمیدی۔ تاریخ بیہقی اسی عہد میں تصنیف ہوئیں۔ غرضکہ فارسی لٹریچر میں اس کثرت سے کتابیں شائع ہوئیں اور زبان فارسی بھی ایسی سلیس و شستہ ہو گئی کہ شاید و باید۔ خاص وجہ اس ترقی کی یہ بھی تھی کہ آل سلجوق کا پایۂ تخت ایران میں تھا اور غزنویہ و سامانیہ سلاطین کا مستقرِ دولت ایران سے باہر رہا لہذا اس عہد میں خاص ایرانی نژاد لوگوں کو ترقی کا موقع ملا اور زبان کی اچھی خاصی اصلاح ہو گئی۔ سلطان سنجر نے غزنویوں کو عروج دیا اور بہرام شاہ کو شاہ غزنین بنایا جسکی علم دوستی کی تاریخ فرشتہ میں تعریف ہے اور تصوف کی شاعری کی بنیاد اسی کے عہد میں پڑی۔ خوارزم شاہیوں میں سلطان اتسز اسی عہد میں خود مختار ہو گیا اور سنجر کو بار بار مقابلہ کرنا پڑا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت سلجوقیہ میں کمزوری پیدا ہو گئی۔ پھر ترکوں نے سنجر کو اس طرح گھیرا کہ برائے نام بادشاہ رہ گیا اور مرو۔ سرخس۔ بیہق اور نیشاپور قبضے سے بالکل نکل گئے۔ آخر ۵۵۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ناصر خسرو

امیر ناصر خسرو علوی بھی اسی عہد کے گلِ سرسبد ہیں۔ سالِ ولادت ۳۹۴ھ ہے۔ ۹ برس کی عمر میں قرآن اور احادیث کثیرہ کو حفظ کر لیا اور ۲۲ برس کی عمر تک طلب علم میں وقت صرف کر کے ریاضیات و الٰہیات میں کمال حاصل کیا اور فقہ و تفسیر وغیرہ میں بھی اچھی خاصی مہارت پیدا کر لی بلکہ تورات و انجیل کا بھی درس ختم کیا۔ پھر چھ سال ریاضت میں صرف کئے اور چالیس برس کی عمر میں تسخیرات و نیرنجات وغیرہ میں دسترس پیدا کیا۔ تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ بکثرت امصار و بلاد کے سفر کئے اور حرمین شریفین اور بیت المقدس کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ مستنصر باللہ فاطمی کے یہاں مصر میں تقریباً تین سال قیام کیا اور وہاں سے واپس آ کے اسمٰعیلیت کی ترویج میں مصروف ہو گئے[۱]۔ بلکہ ایک تفسیر قرآن ملاحدہ کے رنگ میں لکھی جس سے بہت بدنام ہوئے۔ آخر ۴۸۱ھ میں ۱۴۰ برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ ان کے مصنفات میں سفرنامہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ عبارت میں وہی سادگی اور روانی ہے جو قدما میں رائج تھی مثلاً لکھتے ہیں :-

بر سر آن چاہیست کہ نوشادر راز آں حاصل شود و گویند کبریت نیز۔ مردم پوست گاؤ می برند و پر نوشادر می کنند و از سر کوہ بغلطانند کہ براہ نتواں فرود آوردن۔

یہ نمونہ ۴۵۰ھ کی نثر کا ہے۔ امیر صاحب نے ایک کتاب کنز الحقائق بھی نثر میں لکھی ہے۔ اسکے علاوہ نظم میں روشنائی نامہ اور سعادت نامہ و زاد المسافرین ہیں اور ایک دیوان تقریباً بارہ ہزار بیت کا ہے۔ دولت شاہ وغیرہ نے قانون اعظم و

---

[۱] صاحب مجمع الفصحا انھیں اثنا عشری سمجھتے ہیں۔

فلسفہ کی تعریف :-

حکمت آبیست کہ جا مردہ بدو زندہ شود — حکما برلب این آب مبارک شجر ند

تخلیص نہایت خوب ہے :-

شجر حکمت پیغمبر ما بود ہمی — ہر یک از حکمت او نیز درختی ببرند

پسرانِ علیؑ امروز ہمہ او را بسزا — پسرانند چو ہمہ دختر او را پسرند

پسرانِ علیؑ آنہا کہ اماماں حق اند[1] — بجلالت بجہاں در چو پدر مشتہر اند الخ

دیکھو! پرانی زبان کا اثر باقی ہے ۔ زی ۔ ازیرا ۔ مر ۔ ہمی ۔ کجا وغیرہ بے تکلف مستعمل ہیں اور ترکیبوں میں بھی تراش خراش نہیں ہوئی ہے ۔

شب تاریک کا ہول اور اپنے جاگنے کا حال نہایت زور میں نظم کرتا ہے :-

شبے تارے چو بے ساحل دمان پرقیر دریائے
(پر جوش ١٢)

فلک چوں پرّ زنسریں برگ ۔ قیر اندودہ صحرائے
(مراد از ستارگان — از جہت تاریکی)

زمانہ رخ بہ قطران شستہ واز رفتن برآسودہ
(زیرا کہ سیاہ است ١٢ — حرکت سے رکا ہوا)

کہ گوئی نافریدستش خدائے فرد فردائے
(اسی سے رات بہت طولانی ہوگئی ١٢)

ندید از صعب تاریکی و تنگی اندریں خیمہ
(شدت ١٢ — فضائے عالم ١٢)

نہ چشم تار من شخصے نہ جانِ خفتہ رویائے
(مبالغہ مقبول ١٢)

مرا چوں چشم ۔ دل زی خلق ۔ چشم من بسوے شب

چو اندر لشکرے خفتہ یکے بیدار دانائے

اگر سرّا و ضرّا ور ندید ستی ۔ نکو بنگر
(راحت ١٢ — مصیبت ١٢)

ستارہ زیر ابر اندر چو سرّا زیر ضرّائے

---

[1] مشدد کو مخفف کرنا بغرض فصاحت شروع ہوگیا ۔

مخاطب کرتے ہیں :-

راہِ تو بہر قدم کہ پویند خوش است　　وصلِ تو بہر سبب کہ جویند خوش است

روے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست　　نامِ تو بہر زباں کہ گویند خوش است

عشقِ الہیٰ کا مرتبہ یوں ظاہر کرتے ہیں :-

غازی برہِ شہادت اندر تگ و پوست
غافل کہ شہید عشق فاضل تر از اوست
در روز قیامت ایں بداں کی ماند
کیں کشتۂ دشمن است واں کشتۂ دوست

بابا طاہر عریاں

بابا طاہر عریاں (غالباً سنہ ۴۱۰ھ میں انتقال ہوا) سلطان طغرل جب ہمدان میں داخل ہوا تو ایک مقام پر ان سے ملاقات ہوئی۔ بابا طاہر نے کہا "اے ترک اخلقِ خدا کے ساتھ کیا کریگا؟" جواب دیا "جو آپ کا حکم ہو۔" کہا "نہیں وہ کر جو خدا کا حکم ہے۔ ان اللّٰہ یامر بالعدل والاحسان۔ احسان کر اور عدل کر" سلطان رو دیا اور کہا کہ ایسا ہی کرونگا۔ ان کی زندگی کی حالت جذب میں گذری۔ کلام اپنے وطن کی زبان میں ہے جو عروض کے اعتبار سے قطعات میں داخل ہے۔ مقامات صوفیہ کا حال اور حالت جذب میں جوش و خروش قلب کی تصویر ہے :-

مگر شیر و پلنگی اے دل اے دل　　بما دائم بجنگی اے دل اے دل

اگر دستم فتی خونت بریزم　　وِ وِینم تا چہ رنگی اے دل اے دل

افتی ۱۲　　ببینیم ۱۲

وله

دِشُم۔ واشُم ازیں عالم بدر شُم　　دِشُم از چین و ماچین دیر تر شُم

بشوم ای بر کوم ۱۲ ؛ باشم ۱۲ شوم ۱۲

دِشُم از حاجیاں حج بپرسم　　کہ اے دیری بسے یا دیر تر شُم

ہست فرصت ۱۲

مثلاً شراب نوشی کو منع کرتے ہیں :-

نکند عاقل مستی۔ نخورد دانا مے — ننهد مردم ہشیار سوے مستی پے

گر کنی بخشش۔ گویند کہ مے کرد نہ او — در کنی عربدہ گویند کہ او کرد نہ مے

دیکھو کس خوبی سے سمجھایا ہے کہ مستی کے عالم میں اگر اچھائی کرو تو مست کی بات کا اعتبار کیا۔ وہ تو جو کچھ کیا شراب نے کیا اور اگر برائی کرو تو خمیازہ بھگتو۔ گناہ کی معذرت سنو :-

بحرص از شربتے خوردم۔ مگیر از من کہ بد کردم

بیاباں بود و تابستان و آب سرد و استسقا

ہائے اُستاد مرحوم نے کیا خوب اسی مطلب کو ادا کیا ہے :-

فرشتو! رحمت حق سے گنہ میرے بتا دینا

مگر اتنا بھی کہہ دینا یہ باتیں تھیں جوانی کی

جوش و سرمستی اتنی ہے کہ مولانا روم اور حافظ شیراز کے ایسے مست شعرا اسی میخانے کے بادہ خوار نظر آتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا ہے :-

نیم جوشی کردہ ام من نیم خام — از حکیم غزنوی بشنو تمام

نمونتاً چند اشعار ایک قصیدے کے نقل کئے جاتے ہیں :-

برگ بے برگے نداری لاف درویشی مزن

رُخ چو عیاراں میارا جاں چو نامرداں مکن

یا برو ہمچوں زناں رنگے و بوئے پیش گیر

یا چو مرداں اندر آؤ گوے در میداں فگن

ہر چہ آرا از گلشن تحقیق تا در کوے دین

کشتگان زندہ بینی انجمن در انجمن

خوردہ یک بادہ بر رخِ ساقی — ہرچہ باقی است کردہ در باقی

فارغ از صورتِ مرادِ ہمہ — برتر از کثرتِ تضادِ ہمہ

حقیقت یہ ہے کہ حکیم غزنوی اس اساس کے موسس ہیں۔ خود کو بھی احساس ہے :-

کس نگفت اینچنیں سخن بجہاں — ور کسی گفت۔ گو بیار و بخواں!"

زیں نمط ہرچہ درجہاں سخن است — گر یکے ور ہزار آنِ من است

عمر خیام

عمر خیام بن ابراہیم نیشاپوری۔ مشہور ہے کہ طلب علم کے زمانے میں اسکے ہمدرس نظام الملک[1] اور حسن بن صباح تھے۔ تینوں میں صلاح ہوئی کہ جو کوئی ہم میں سے بڑے منصب پر پہونچے اپنے ساتھیوں کو بھی بڑے مرتبے عطا کرے۔ اتفاق روزگار کہ نظام الملک کو وزارت نصیب ہوئی اور حسب معاہدہ دونوں ساتھیوں کے ساتھ سلوک کرنا چاہا مگر حسن بن صباح کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے البتہ عمر خیام کو (حسب روایت آتشکدہ) نیشاپور میں جاگیر عطا کی۔ خیام کی حیثیت اگرچہ معمولی جاگیردار کی تھی مگر علم و فضل کی بدولت نہایت محترم تھا۔ سلاطین وقت اسے اپنے برابر بٹھاتے تھے اور علمائے اسلام فلسفہ و حکمت میں ابن سینا کا ہمسر، اور فقہ و حدیث میں "امام خراساں" اور "علامہ زماں"[2] سمجھتے تھے۔ ریاضیات میں رصد خانہ ملک شاہی (۴۶۷ھ) کی بنا اور زیج ملک شاہی یادگار ہیں۔ تفسیر و قرات میں بھی بلند پائگی کے ثبوت تاریخ الحکمائے شہرزوری وغیرہ میں ملتے ہیں۔ فلسفیانہ مذاق کیوجہ سے علمائے عصر کے قلوب

---

[1] پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ نوشیرواں بن خالد وزیر آل سلجوق ان کا ہمدرس ہوگا کیونکہ نظام الملک اور ان دونوں کی عمر میں بہت تفاوت ہے ۱۲۔

[2] تاریخ الحکمائے قفطی۔

کہا جا سکتا ہے خیام کے زمانے میں خود مختار سلطنتوں کا زور تھا اور لوگوں کی خوشحالی اور پریشان حالی سلاطین وقت کے اشاروں پر تھی حکیمانہ مذاق کا آدمی ایسے وقت میں خوشحالی کے لمحوں کی قدر کریگا اور جو اچھائی اپنے یا دوسروں کے لئے کرلے گا وہی غنیمت ہے۔ اسی امر کی طرف خیام کی ترغیب ہے اور چونکہ واقعی شراب خوار تھا اس وجہ سے اخلاقی قوت یا روحانیت کے رنگ و بو سے اسکے شراب و کباب کو خالی سمجھا جاتا ہے ورنہ نظر انصاف حافظ وغیرہ کو اسی خمخانہ میں بادہ کشی کرتے ہوئے دیکھتی ہے۔

خیام چاہتا ہے کہ آئندہ کی زندگی پر بھروسا نہ کیا جائے چاہے کتنی ہی دلچسپ نظر آتی ہو۔ حور و قصور کو بھی موجودہ عیش کے مقابلہ میں بے اعتبار سمجھتا ہے۔ بہشت و دوزخ کسی چیز کی پروا نہیں۔ دیکھو کس مستی کے عالم میں اپنا خیال ادا کرتا ہے:۔

ما ئیم خریدار مئے کہنہ و نو[1] — وانگاه فروشندهٔ عالم به دو جو
گفتی کہ "پس از مرگ کجا خواهی رفت؟" — "مے پیش من آر و هر کجا خواهی رو"

بے خودی کا عالم اور سیہ مستی کی حد دیکھو:۔

من بے مئے ناب (خالص) زیستن نتوانم — بے جام کشید۔ بار تن نتوانم
من بندهٔ آں دمم کہ ساقی گوید — "یک جام دگر بگیر و من نتوانم"

شوخی و ظرافت کا انداز بھی عجیب دلکش ہے۔ ایران میں رمضان مبارک کے زمانے میں شراب فروشی کی بالکل ممانعت ہے اور رسم ملک یہ ہے کہ شرابخوار اس ماہ میں شراب خواری ترک کر دیتے ہیں خیام کہتا ہے:۔

گویند کہ ماہ روزہ نزدیک رسید — زین بعد بہ گرد بادہ نتوان گردید
(بعد ازاں شراب کے قریب بھی آنا ممکن نہیں ۱۲)
در آخر شعبان بخورم چنداں مے — کاندر رمضان مست بخفتم (بخوابیم ۱۲) تا عید

---

[1] جو لذت مل چکی ہے اور جو مل رہی ہے۔

حاصل کرتے ہیں اور سعادت کے تلاش کرنے والے اُن حقائق سے
اپنی زندگی کو مرتبط کرنا چاہتے ہیں جن سے ترقی کائنات وابستہ ہے یہیں سے
معلوم ہوتا ہے کہ خیام کا فلسفہ مسرت پرستی کا نہیں۔ وہ ہوا و ہوس
سے دور بھاگتا ہے :-

گر از پے شہوت و ہوا خواہی رفت　　از من خبرت کہ بے نوا خواہی رفت
میں تجھے بتائے دیتا ہوں کہ انجام بخیر نہیں ۱۲
بنگر چہ کسی و از کجا آمدۂ؟　　می دان کہ چہ میکنی؟ کجا خواہی رفت؟

لیکن فلسفیانہ جد وجہد کا سرحد حقیقت تک پہونچنا دشوار ہے کیونکہ
حق الحقائق کا مقام عالم روحانیت ہے بلکہ شاید اس سے بھی بالاتر۔ آج
ایک چیز کو علت العلل سمجھتے ہیں۔ کل اسکے مافوق دوسری طاقت نظر آتی ہے۔
اس وقت ایک مسئلہ ایک عنوان سے حل ہوتا ہے۔ دوسرے وقت
وہی عنوان باطل نظر آتا ہے اور مسئلہ اسی حالتِ ابہام میں آجاتا ہے۔
اسی وجہ سے لاعلمیت کا مسلک کا مل فلسفیوں کے لئے منتہائے کمال ہے
اور مایوسی کا پیش خیمہ۔ اہل مذہب اور ارباب معرفت کے یہاں
لاعلمی کا مرتبہ اعلیٰ اور اتم ضرور ہے مگر وہاں اطمینان قلب ساتھ ہے
اور انکشافات عالیہ کی امید سے وابستہ ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے :-

فلسفی سِرِّ حقیقت نتوانست کشود　　گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا میکرد

خیام کا کلام کبھی فلسفیانہ رنگ کا ہے۔ کبھی اہل مذہب کے
رنگ کا۔ خدا جانے حقیقت کیا تھی؟

آنہا کہ محیطِ فضل و آداب شدند　　در کشفِ دقیقہ شمعِ اصحاب شدند
رہ زیں شبِ تاریک نبردند بروں　　گفتند فسانۂ و در[1] خواب شدند
جہل ۱۲

---

[1] ایرانی زبان کا اثر ہے کہ واؤ عطف معطوف علیہ سے جدا کیا گیا۔

اور بعض نظامی گنجوی سے منسوب کرتے ہیں۔ اسکی تصنیف کا زمانہ وہی ہے جب طغرل نے رومیوں پر فتح پائی تھی۔ سلطان محمد بن محمود سلجوقی کے زمانے میں مقرب بارگاہ رہا۔ آخر عمر میں دل شکستگی غالب آگئی۔ بعض اشعار مثنوی کے درج کئے جاتے ہیں۔ رامین ویسہ کے فراق میں بیقرار ہے اور دل کی الجھن الفاظ میں ادا کرتا ہے :۔

ندانستم کز آتش آب خیزد	ز شہد ناب زہر ناب خیزد
بگریہ گہہ دل راکنم خوش	ہمیخواہم کشم آتش بہ آتش
جہان کردم ز آب دیدہ پر گل	نمرد از آب چشم آتش دل
منم بے یار و از دردم بسے یار	منم بیکار و از عشقم بسے کار
مرا مادر دعا کرد ست گوئی	کہ از تو دور بادا ہر چہ جوئی
اگر خواند آرش[1] را کماں گیر	کہ از آمل بہ مرو انداخت یک تیر
تو اندازی بجان من ز گوراب	ہمی ہر ساعتے صد تیر پرتاب

عنصر المعالی

امیر عنصر المعالی کیکاؤس پسر زادہ قابوس نے ۶۳ برس کی عمر میں قابوس نامہ اپنے بیٹے گیلان شاہ کے لئے تصنیف کیا۔ دیکھو! اس عہد کے سلاطین بھی مصنفوں کے گروہ میں امتیاز پیدا کرتے تھے۔ یہ کتاب مفید مضامین کا مجموعہ ہے اور بیش بہا نصیحتوں کا خزانہ۔ عفو و مکافات۔ لطف زندگانی۔ حسن و عشق۔ تعلیم اطفال۔ آداب وزارت۔ خصائل ملوکانہ وغیرہ کے عنوانات پر اپنے

---

[1] برادرزادہ کا ششم درث۔ کہتے ہیں کہ چچا نے کہا کہ تم تیر مارو جہاں تک پہنچے گا اتنی زمین تم کو دونگا۔ حکما نے تیر کے اندر جوف کرکے پارہ بھر دیا۔ آرش نے آفتاب کی طرف رخ کرکے تیر پھینکا۔ حرارت آفتاب کی وجہ سے آمل سے مرو تک چلا گیا۔ دولت شاہ کہتا ہے کہ چالیس منزل تیر کا چلا جانا خلاف عقل ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ یہ نام دو قریوں کے ہوں جنکے درمیان فاصلہ کم ہو۔

اشعار میں بھی کمالات صوری و معنوی کا اثر موجود ہے :-

گفتم دلا تو چندیں بر خویشتن چہ پیچی | با یک طبیب محرم ایں راز در میان نہ
گفتا کہ ہم طبیبے فرمودہ است با من | گر مہر یار داری صد مُہر بر زبان نہ

ولہ

کس را بپس پردۂ قضا راہ نشد | در سرّ قدر ہیچکس آگاہ نشد
ہر کس ز سر قیاس چیزے گفتند | معلوم نگشت و قصّہ کوتاہ نشد

امام احمد غزالی بھی صاحب تصانیف تھے۔ سوانح العشاق میں مراتب عشق بیان کئے ہیں اور کئی مصنّفات یادگار چھوڑے ہیں۔ ۵۱۷ھ میں انتقال ہوا۔ شعر گوئی میں رنگ بالکل اپنے بھائی کا ہے۔

ازرقی

ازرقی حکیم زین الدین ابوبکر ہروی کا عروج سلطان طغانشاہ بن مؤید سلجوقی کے عہد میں ہوا۔ پہلے بادشاہ کا ندیم ہوا پھر ملک الشعرائی کے مرتبے پر پہونچا۔ ۵۲۶ھ میں وفات پائی۔ کتاب سندباد اور دیوان قصائد وغیرہ یادگار ہیں۔ اکثر معانی نفیسہ اور مضامین عالیہ اسکے کلام میں ملتے ہیں مثلاً ایک قصیدے کی تشبیب میں نہایت لطف سے ابر کا حال نظم کیا ہے کہ ابتدا اس کی پانی کے بخارات سے ہے جو آسمان کی طرف صعود کرتے ہیں اور انتہا میں قطرات باراں کی صورت میں پھر زمین پر واپس آتے ہیں :-

چہ جرم است اینکہ ہر ساعت ز پیچ نیلگوں دریا | زمیں را سائباں بندد بپیش گنبد خضرا
چو در بالا بود باشد زمینش خشک در پستی | چو در پستی بود باشد نگاہش دور بر بالا
گہے از دامن دریا رود بر گوشۂ گردوں | گہے از گوشۂ گردوں رود بر دامن دریا
سیاہش را برانگیزد بدریا بر زند غارت | مصافش را بہم پیوندد بگردوں بر کند غوغا
ازان غارت ببخشاید ہوا را افسر لولو | ازان غوغا بپوشاند زمین را حلۂ دیبا

ازرقی کے اشعار سے مقابلہ کرو تو اندازہ ہوجائے گا کہ امیر مسعود کا کلام کتنا شستہ ہے:۔

سیاہ ابر نیسانی ز دریا رفت بر صحرا　　نثار لولوے لالا بصحرا برد از دریا

ازیں پُر مشک شد گیتی وزاں پُر دُر ہمہ عالم　　ازیں پُر بوئے شد بستاں وزاں پُر نور شد صحرا

گہے چوں تختہ تختہ سادہ سیم اندر ہوا برہم　　گہے چوں تودہ تودہ سودہ کافور ست بر بالا

فلک در سندس نیلی ہوا در چادر کحلی　　زمیں در فرش زنگاری کہ اندر حلۂ حمرا

زمین خشک شد سیراب باغ زرد شد اخضر　　ہوائے تیرہ شد روشن جہانِ پیر شد برنا

امیر معزی　امیر معزّی محمد بن عبدالملک نیشاپوری کو آل سلجوق کے دربار میں وہی بات حاصل تھی جو رودکی کو سامانیوں کے یہاں اور عنصری کو سلطان محمود کی بدولت نصیب ہوئی تھی۔ پہلا قدردان ملک شاہ سلجوقی تھا اور دوسرا معز الدین سنجر جس نے ملک الشعرائی کا خطاب دیا اور اپنے نام پر تخلص کو منسوب کرنے کی اجازت عطا کی۔ ایک دفعہ سنجر اور امرائے دولت استہلال عید کے لئے باہر آئے۔ سب سے پہلے سنجر کی نظر چاند پر پڑی۔ خوشی سے اُچھل پڑا اور سب کو انگلی کے اشارے سے چاند دکھلایا۔ معزی کو حکم دیا کہ ماہ نو کی تعریف کرو۔ فی البدیہہ یہ شعر نظم کئے:۔

اے ماہ چو ابروان یاری گوئی　　یا ہمچو کمانِ شہریاری گوئی

نعلے زدہ از زر عیاری گوئی　　در گوشِ سپہر گوشواری گوئی

آج یہ تشبیہیں پیش پاافتادہ معلوم ہوتی ہیں لیکن جن دماغوں نے پہلے پہل ان کو پیدا کیا ہوگا اُن کے کمال میں کیا شک ہے۔ بادشاہ نے خاصہ کا گھوڑا اور پانچ ہزار درہم عطا کئے۔ قدردانی نے شاعر کے دل میں اور امنگ پیدا کی۔ شکریہ ادا کیا تو صنعت تضاد کا لطف دکھایا اور عناصر اربعہ کو یکجا کر کے پیش کیا:۔

دیکھا تو دل بھر آیا حالانکہ معشوق اگر کھڑا ہوتا تو نہر کی واقعی زینت ہو جاتی۔
ان خیالات کی تصویر کھینچتا ہے اور سراسیمگی کا مرقع ساتھ ہی ساتھ دکھاتا ہے:۔

بہ لالہ زار شوم پیشِ لالہ نالہ کنم	اگرچہ رنگ رخش (چہرۂ معشوق) رنگ لالہ زار بود
بجوئبار شوم پیشِ سرو سجدہ کنم	اگرچہ قامت او (معشوق) سرو جوئبار بود

استعارات کا لطف دیکھو۔ ایجاد کرنے والے کی زبان سے (یعنی نہر کی واقعی زینت) کتنے اچھے معلوم ہوتے ہیں اور نقل کرنے والوں کے لئے کس قدر معمولی:۔

عاشقِ آنم کہ عتابش ہمی بارد شکر	فتنۂ آنم کہ سخا بش ہمی پوشد جگر
خستۂ آنم کہ از گل تودہ وارد بر سمن	بستۂ آنم کہ از شب حلقہ وارد بر کمر
از شرر ہرگز جدا آتش نخیزد پس چرا	بر رخ او آتش است و چشم من بارد شرر الخ

رشید وطواط

رشید وطواط۔ رشید الدین محمد بن عبدالجلیل الکاتب العمری بلخ میں پیدا ہوا اور خوارزم میں سلطان اتسز خوارزم شاہی کی بدولت عروج پایا۔ دولت شاہ کہتا ہے کہ تیز زبان اور کم جثہ شخص تھا اسی سے وطواط (چڑیا) کہلاتا ہے۔ اتسز نے جب ملکشاہ سے بغاوت کی اور ہزاراسپ (نام مقام) میں محصور ہوا تو انوری نے یہ رباعی سلجوقیوں کی طرف سے کہی:۔

اے شاہ ہمہ ملک جہاں حسب تراست	وز دولت و اقبال جہاں کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزاراسپ بگیر	فردا خوارزم و صد ہزار اسپ تراست

رشید نے جواب دیا:۔

شاہا کہ بجام مے صافیست نہ دُرد	اعدائے ترا ز غصہ خوں باید خورد
گر خصم تو اے شاہ بود رستم گرد	یک خر ز ہزار اسپ نتواند برد

ملکشاہ کو غصہ آگیا اور قسم کھائی کہ جب قلعہ فتح کروں گا تو رشید کے سات ٹکڑے کر ڈالوں گا۔ آخر جب اتسز ہزیمت کھا کے بھاگا تو رشید پکڑ کے

ہجو بھی کہتا تھا مگر بیحد رکیک جنھیں نقل کرنا خلاف تہذیب ہے۔

انوری

انوری۔ حکیم اوحد الدین علی بن اسحٰق آبیوردی[1] خاوری کا عروج سلطان سنجر کے زمانے میں ہوا اور اسی دربار کا شاعر اور مداح ہے۔ اوائل زندگی میں منصوریہ طوس وغیرہ میں درسیات ختم کئے اور فلسفہ و نجوم وغیرہ میں دستگاہ کامل پیدا کی۔ کہتے ہیں کہ باوجود کمال نہایت عسرت میں بسر کرتا تھا۔ ایک روز ایک شخص کو بڑی شان و شوکت سے گھوڑے پر سوار جاتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا کہ یہ کون ہے۔ معلوم ہوا کہ "شاعر" کہنے لگا کہ افسوس ایسی باوجود حکیم ہونے کے تنگدست ہوں اور یہ شخص باوجود اس کم حیثیت پیشہ[2] کے اس ثروت پر فائز ہے۔ خود بھی فن شعر کیطرف متوجہ ہوا اور رات بھر میں ایک قصیدہ کہہ کے سلطان سنجر کے دربار میں پڑھا اور تقرب سلطانی حاصل کیا۔ یہ قصیدہ نہایت زوردار ہے اور مشہور ہے ابتدا یوں ہے:۔

گر دل و دست بحر و کان باشد ۔۔۔ دل و دست خدایگان باشد

پروفیسر براؤن اور مولانا شبلی دونوں نے تعجب کیا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے کیوں ایسے قصیدہ غرا کو ابتدائی شاعری بلکہ ایک رات کی مشق کا نتیجہ سمجھا حالانکہ انوری خود اسی قصیدے میں کہتا ہے:۔

خسروا! بندۂ تو دہ سال است ۔۔۔ کہ ہمی آرزوے آں باشد

کز ندیمان مجلس او نشود ۔۔۔ از مقیمان آستاں باشد

---

[1] خراسان کے ایک علاقہ کا نام دشت خاوران ہے۔ آبیورد اسی کا ایک قریہ ہے جہاں انوری پیدا ہوا تھا اور عوفی کا خیال ہے کہ مہنہ میں پیدا ہوا تھا جو آبیورد سے قریب ہے۔ ممکن ہے کہ اس قریہ کے مضافات میں سے ہو چنانچہ کہتا ہے:۔ "انوری گر بود از مہنہ مقیم از شیراز"۔ ابتدا میں خاوری تخلص تھا کیونکہ دشت خاوران میں اس کا وطن تھا۔

[2] اس زمانے میں شاعری نے پیشہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ امرا کی جھوٹی تعریفیں کر کے انعام حاصل کئے جاتے تھے اور انھیں انعاموں پر معاش ہو گئی تھی۔

تلاطم ہو گیا اور حفاظت کے لئے کوئی تہ خانہ میں چھپا۔ کوئی شہر سے باہر بھاگا۔ اتفاق کی بات کہ اُس رات کو اتنی بھی ہوا نہ چلی کہ میناروں کے چراغ بجھ جاتے بلکہ سال بھر ہوا اتنی کم رہی کہ کھلیان کے کام میں زحمت ہوئی۔ بادشاہ بہت ناراض ہوا اور انوری وہاں سے بھاگ کر بلخ گیا[1]۔ یہاں سوزنی یا ابوالفرج رونی نے ایک ہجو اہل بلخ کی بہت سخت کہہ کر اسکے نام سے مشہور کر دی۔ وہ لوگ بگڑ گئے اور بد نصیب انوری کو خوب پیٹا اور اوڑھنی اُڑھا کے شہر میں تشہیر کیا۔ قاضی حمید الدین[2] وغیرہ نے حمایت کی تو جان بچی چنانچہ قاضی صاحب کی مدح میں کہتا ہے :۔

بمدح و ثنا گر کنم رائے نظمے | نہ دشوار گویم نہ آسان فرستم
ولیکن بمدح جناب حمیدی | اگر وحی باشد ہراسان فرستم

آخر گردش زمانہ سے تنگ آکے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۵۸۵ھ یا ۵۸۷ھ میں انتقال کیا۔

انوری کا شمار شریعت شاعری کے تین پیغمبروں میں سے ہے اور سعدی و فردوسی کا ہم مرتبہ سمجھا گیا ہے اگرچہ یہ درجہ ویسے حد سے بڑھا دیا گیا کیونکہ (حسب تحقیق مولانا شبلی) اس کی ذات سے کوئی اضافہ قصیدہ گوئی میں نظر نہیں آتا یہ دوسری بات ہے کہ ادیب صابر۔ ازرقی۔ رشید و طواط وغیرہ سے عمدہ کہتا ہے البتہ اسکی شاعری میں معاصرین سے زائد علمی کمالات کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً وہ مشہور قصیدہ جو واقعۂ نا مرضیہ بلخ کے متعلق نظم کیا ہے مطلع ہی سے ظاہر کرتا ہے کہ نظم کرنے والا نجوم و فلسفہ و منقولات سب میں کمال رکھتا ہے۔

---

[1] شعر العجم میں بلخ سے پہلے خوارزم جانے کا حال لکھا ہے اور سلطان احمد فیروز شاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ نقل کیا ہے جس میں سفر کے صعوبات کا نہایت خوبی سے ذکر ہے۔ [2] مصنف مقامات حمیدی۔

میرے لئے خوشگوار تھے۔ اب میرا ستارہ گردش میں آ گیا اور بلخ کے واقعے میں وہی شاعری میری ذلت اور مصیبت کا باعث ہوئی (کیونکہ نہ میں شاعر اور ہجوگو ہوتا نہ دوسروں کے اشعار مجھ سے منسوب کئے جا سکتے) اور عدل و انصاف کی کچہریوں نے میرے خلاف حکم سنا کے مجھے تشہیر کرایا اور عزت و راحت کے اسباب بھی میرے خلاف ہوئے۔ کسی کو میری عزت پر حسد ہوا کسی کو میرے آرام پر۔ پھر مسلمانوں کو مخاطب کرنا بھی لطف سے خالی نہیں۔ کبھی اخوت اسلامی سے اپیل ہے۔ کبھی اثر سے موثر کو ثابت کرکے اُس قوم کو مخاطب کرتا ہے جس کا نجوم پر اعتقاد نہیں۔

اسی طرح ایک قصیدہ میں اُن امور سیاسی اور نظم معاشرت کی طرف اشارہ کیا ہے جو افلاطون وغیرہ کے کتب معتبرہ میں درج ہیں جنھیں تقسیم عمل کا فلسفہ بیان کیا ہے کہ مدینۂ فاضلہ میں ہر پیشہ ور اور صاحب ہنر کی ایک ضرورت ہے اور ایک جگہ ہے کیونکہ بقائے نوع انسانی کے لئے وہ ایک کام کر رہا ہے۔ چمار ہو یا لوہار۔ نجار ہو کہ معمار۔ غرض بادشاہ و وزیر سے لیکے نان پز بلکہ کناس یعنے مہتر تک کی ضرورت انسان کو ہوتی ہے اور سب کے لئے مدینۂ فاضلہ میں امتیازی جگہ ہے مگر شاعر کی کوئی ضرورت نہیں[1] لہذا وہ کسی جگہہ اور کسی امتیاز کا مستحق نہیں۔ کہتا ہے:۔

اے برادر بشنوی رمزے زشعر و شاعری	تا ز ما مشتے گدا کس را بمردم نشمری
زانکہ از کناس ناکس در مما لک چارہ نیست	حاش للہ تا ندانی این سخن را سرسری

(امرا کے قصیدہ گو — مہتر)

[1] یہ حالت اُن شاعروں کی ہوسکتی ہے جو محض جھوٹی خوشامدیں اُمرا کی کرتے ہیں ورنہ سچے شاعروں نے جو ہیجان قوموں میں پیدا کر دیئے ہیں اور جس طرح ایک ایک شعر نے مردہ قوتوں کو زندہ کیا ہے اُن کے حالات سے یونان و عرب و عجم وغیرہ کی تاریخیں بھری ہوئی ہیں۔ ایسے شاعر کا وجود اخلاق فاضلہ کے قیام کے لئے نہایت ضروری ہے اور مدینۂ فاضلہ میں اُس کی جگہ امتیاز کے ساتھ ہونی چاہیئے۔

سفید ہوتا ہے۔ ادہم اور اشہب سے معلوم ہوا کہ رات اور دن برابر ہیں۔ ارجل سے معلوم ہوا کہ رات کا کسی قدر حصہ سفید ہو گیا اور "کند" سے معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ یہ حصہ سفید ہوا ہے ایک دم سے نہیں۔ پھر اشہب روز کو فاعل قرار دیکے (کرتا ہے) اس سفیدی کو دن کا مال قرار دیدیا۔ عرفی ایسا نازک خیال اس پختگی سے قاصر ہے:۔

چہرہ پرداز جہاں (آفتاب) رخت کشد چوں بحمل (داخل ہوتا ہے) — شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

دن کو پورے چہرے کی تصویر کہا ہے اور رات کو آدھے چہرے کی جو بجز مبالغہ کے اور کسی صورت میں ہندوستان اور ایران کی حالت نہیں ہو سکتی۔ ورنہ اوراعتبار سے مطلع لطیف تر ہے۔ علاوہ بریں کلام عرب سے اقتباسات لفظی و معنوی کرکے کلام کو مزین کرتا ہے کہیں تلمیعات نفیسہ ملتی ہیں کہیں تلمیحات نادرہ۔ مثلاً کہتا ہے:۔

خصم تو و قاعدۂ ملک او — آں شدہ آز بدو جہاں (ابتدائے آفرینش) مستقیم

چوں دو بنا بود برافراشتہ — زاں دو یکے محدث و دیگر قدیم

زلزلۂ قہر تو شان کرد پست — زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم

واقعہ نگاری بھی خوب کرتا ہے خصوصاً ایک قصیدہ تو نہایت دردناک کہا ہے جس میں سلطان سنجر[1] کی گرفتاری کے بعد ملک کی بدامنی اور پریشانی کی حالت دکھائی ہے:۔

---

[1] یہ واقعہ نہایت عبرتناک ہے۔ تاتاریوں کا ایک قبیلہ غز نواحی ختلان میں مقیم تھا جسکا تعلق حکومت بلخ سے تھا اور چوبیس ہزار بھیڑیں سلطان سنجر کے باورچیخانہ کے لئے سالانہ بطور خراج دیتا تھا۔ داروغہ باورچی خانہ سے کچھ ان بن ہو گئی اور قماج والی بلخ نے انکی تادیب کے لئے حملہ کیا مگر خود شکست کھا گیا اور بیٹا بھی کام آگیا۔ اس فتح کے بعد غزوں کو خوف سلطانی پیدا ہوا اور عذر خواہی کے ساتھ ایک لاکھ درہم اور ہزار غلامان ترکی نذر دینے کو تیار ہو گئے مگر امرا دربار سلطانی نے انکے استیصال ہی کی رائے دی۔ غرض لوگ تمام ہراس میں اس جوش و خروش سے لڑے کہ سنجر کی فوج ہزیمت پا گئی اور خود گرفتار ہوا اور مرو و نیشاپور وغیرہ میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ جامع مسجد اور مسجد مطرز ایسی عمارتیں جلا دی گئیں امام محمد عکاف اور محمد بن یحییٰ سے زاہد و عابد قتل ہوئے۔ عورتیں سواہ ہوئیں بچے ذبح کئے گئے۔ غرض ۵۴۸ھ سے ۵۵۲ھ تک تمام خراسان اسی تباہی میں رہا۔ آخر سنجر کسی نہ کسی طرح انکی قید سے بھاگ کے باہر آیا مگر موت نے مہلت نہ دی کہ حالت درست کرتا۔

اختیار کیا۔ ابو العلا نے بہت مراعات کی اور اپنی بیٹی کے ساتھ عقد کر دیا۔ دوسرے شاگرد فلکی شروانی کو یہ مراعات ناگوار ہوئی۔ ابو العلا نے اُسے بیس ہزار روپیہ یعنے پچاس خوبصورت کنیزوں کی قیمت دیکے راضی کیا۔ خاقانی کی رسائی دربارِ خاقان میں بھی ہو گئی اور حکم سلطانی ہوا کہ ہر قصیدہ پہ ہزار اشرفیاں انعام دی جائیں جب عروج و ثروت نے ترقی کی تو اُستاد کا مخالف ہو گیا۔ ابو العلا کو یہ رفتار ناگوار ہوئی اور کہا:۔

تو ئی افضل الدین اگر راست پرسی بجانِ عزیزت کہ از تو نہ شادم
بخاقانیست من لقب بر نہادم ترا دختر و مال و شہرت بدادم
چرا حرمت من نداری تو کز من ترا ہم پدر خوانده ہم اوستادم

خاقانی نے اسکے جواب میں ایک رکیک ہجو کہی جو قابل نقل نہیں ہے۔ پروفیسر خانکاف روسی نے اس ہجو کی معذرت میں کہا ہے کہ "بارھویں صدی (عیسوی)، کے ایرانی کا غصہ ہے اور اُسی کی زبان اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ یوروپ کی زبان میں ایسے ہی گندے الفاظ داخل تھے"۔ شروان شاہ کی نازک مزاجی کیوجہ سے خاقانی کو اپنے عروج پر اطمینان نہ تھا آخر اجازت لے کر حج بیت اللہ کو گیا۔ اس زمانے میں سلطان سنجر کی فیاضی کو سُن کے جی چاہا[1] کہ وہاں رسائی پیدا کرے مگر کامیاب نہ ہوا۔ خوارزم شاہیوں سے بھی اسکے تعلقات بعض قصاید سے ظاہر ہوتے ہیں اور وہاں کے ملک الشعرا رشید وطواط کی تعریف میں اشعار بھی کہے ہیں۔ غرض فراغت حج کے بعد اصفہان آیا مگر یہاں اسکی قسمت کچھ

---

[1] یہ ارادہ کئی قصیدوں میں مذکور ہے مثلاً:۔

بخراساں شوم انشاء اللہ ازرہ آساں شوم انشاء اللہ یا
رہ روم مقصد امکاں بخراسان یابم تشنہ ام مشرب احساں بخراسان یابم

اسی میں اپنی ترقی کی اُمید ظاہر کرتا ہے:۔

چوں زمن اہل خراساں ہمہ عنقا بینند من سلیمانِ جہانباں بخراسان یابم

کے بعد رہائی ہوئی تو دنیا کو ترک کرکے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ قصائد سے معلوم ہوتا ہے کہ منوچہر کے بعد بھی زندہ رہا اور زوجہ اور پسر رشید کا بھی سانحہ ہی انتقال ہوا۔ غرض اسی زاویہ نشینی کی زندگی ختم کرکے ۵۹۵ھ بروایت حبیب السیر میں انتقال کیا اور مقبرۃ الشعراء سرخاب میں قبر بنی۔ ملّا جامی نے خاقانی کو اولیائے کرام میں شمار کیا ہے جسکی وجہ یہی آخری زمانہ زندگی کا ہو سکتا ہے۔

شاعری میں صاحب آتشکدہ انھیں طرز خاص کا موجد سمجھتے ہیں اور بعض شعرا نے یوں مدح کی ہے:-

ز دیوان ازل منشور کاول درمیاں آمد ‏ اسیری جملہ دادند و سلطانی بہ خاقانی

برائے حجت معنی۔ براہیمے پدید آمد ‏ ز تیشت آذرِ صنعت علی نجار شروانی

کلیات خاقانی نہایت ضخیم ہے۔ بیشتر قصائد کے ہیں مگر غزلیں اور قطعات وغیرہ بھی موجود ہیں اور ایک مثنوی تحفۃ العراقین ہے جسے زمانۂ قید میں نظم کیا ہے۔ قصیدہ کی زبان وہی معاصرین کی ہے۔ شیرینی میں انوری و ظہیر سے کم ہے اور جزالتِ الفاظ میں بہت بلند۔ مقاماتِ صوفیہ و مصطلحاتِ حکمیہ و تلمیحات تاریخیہ کا بیش بہا خزانہ چھوڑا ہے اگرچہ انہیں سے بعض غیر مانوس ہوتی ہیں اور لطفِ کلام پر اثر ڈالتی ہیں تشبیہات بھی نادر ہیں مگر پرانے ڈھنگ کی۔ ایک قصیدہ قیصر روم کے پاس بھیجنا چاہا تھا کہ قید سے رہائی پائے اسکی تشبیب میں تمام مصطلحات عیسائی مذہب کے ہیں۔ نمونہ کے طور پر بعض اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

فلک کج رو ترست از خط ترسا ‏ مرا دارد مسلسل راہب آسا

نہ روح اللہ بریں دیر است چوں شد ‏ چنیں دجال فعل ایں دیر مینا

تنم چوں رشتۂ مریم دو تا ہست ‏ دلم چوں سوزن عیسیٰ است یکتا

من اینجا پائے بند رشتہ ماندم ‏ چو عیسیٰ پائے بند سوزن آنجا

بعض مقامات خوب کہے ہیں :-

چناں در بوتۂ تلقیں مرا بگداخت کاندر من
نہ شیطاں ماند و وسواسش نہ آدم ماند و عصیانش

+ + + + +

+ + + + + +

زہے تحصیل دانائی کہ سوئے خود شدم ناداں
کرا استاد دانا بود چوں من کرد نادانش

چو طوطی کائنہ بیند شناس خود نیفتد سپے
ز خود در خود شود حیراں کند حیرت سخندانش

مشکل یہ ہے کہ خاقانی کے اشعار کی تشریح کی ضرورت ہے اور یہ کتاب مختصر اُن تفاصیل کو برداشت نہیں کر سکتی ورنہ اُس کا مبلغ علم ناظرین کو معلوم ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس طرز کا خود ہی موجد تھا اور اپنے ہی اوپر ختم کر گیا۔ کسی سے اس کی تقلید بھی نہیں کیونکہ جن باتوں کا اس نے التزام کیا ہے یا کرتا ہے ان کو قائم رکھ کے ایک ہی زور میں کئی کئی سو شعر کے قصیدے کہتا ہے اور نباہ لے جاتا ہے۔ خصوصاً مشکل ردیف اور قافئے پر اتنی حکومت ہے کہ اسکے آگے بالکل پانی ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہی مگر شیرینی نہ ہونے کی وجہ سے مُلّائیت کا غلبہ اور شاعریت کا اضمحلال ہے۔ البتہ جہاں کہیں ان جھگڑوں سے پاک ہو کے کہتا ہے۔ بات ہی اور ہو جاتی ہے۔ شراب کی تعریف میں سنو :-

مے آفتاب زرفشاں۔ جامِ بلورش آسماں
مشرق کفِ ساقیش داں مغرب لبِ یار آمدہ

غزلوں میں بھی وہی علمی رنگ غالب ہے کیونکہ اس زمانے تک غزلوں کی

مجدؔ ہمگر[1] انوری کو ظہیر پر ترجیح دیتا ہے مگر ظہیر کی عظمت کا بھی مقر ہے۔

شعر یکے برآمدہ چوں دُرِّ شاہوار — نظم دگر برآمدہ چوں مہر خاوری

شعر ظہیر اگرچہ برآمد ز جنس شعر — برتر ز انوری نزند لاف شاعری

امامی ہروی دونوں کو یوں سراہتا ہے (ضمیر قریب انوری کے لئے ہے بعید ظہیر فاریابی کے لئے):-

ایں سحر ست و آں سحر — آں شمع و ایں چراغ

ایں ماہ و آں ستارہ — ایں حور و آں پری

دولت شاہ کہتا ہے "افاضل و اکابر متفق اند کہ سخن ظہیر نازک تر و باطراوت تر از سخن انوری ست"۔ حقیقت یہ ہے کہ نقادانِ سخن نے اس معاملے میں بہت افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ نہ انوری پیغمبر سخن ہے نہ ظہیر بالکل بے حقیقت۔ اگر انوری نے متانت و جزالت کے ساتھ ساتھ بلند مضامین پیش کئے تو ظہیر نے بھی شوخی بیان اور شیرینی ادا کو کمال پر پہونچا کے مضمون آفرینی کی۔ ان دونوں شاعروں کے پہلے قصیدہ گوئی میں الفاظ کی صنعت گری پر زیادہ زور دیا جاتا تھا یہاں تک کہ امیر معزی اور عبدالواسع جبلی وغیرہ بھی انھیں جھگڑوں میں پھنسے رہتے تھے۔ کبھی ہم وزن الفاظ کا التزام تھا۔ کبھی مرادف الفاظ کی بھرمار تھی۔ ان دونوں نے معنویت نظم کو ان بدمزہ التزامات سے پاک کیا اور آورد سے بچا کے زبان شعر میں روانی اور آمد پیدا کی بلکہ ظہیر اس معاملۂ خاص میں انوری سے بھی بہتر ہے۔ اگر مضمون کی بلندی یہ چاہتی ہے کہ زبان میں بھی دقت پیدا ہو جائے تو وہ غالب آجاتا ہے۔ مضمون کے بعض اجزا

---

[1] مجد ہمگر کی تنقیدی نظر نے امامی کو سعدی سے بڑھا دیا ہے چنانچہ شیخ صاحب نے ناراض ہو کے کہا۔

ہمگر کہ بعمر خود نکردست نماز — شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نرسد

کہ ممدوح کی حکومت زمانہ پر ہے (یعنے واقعات عالم کو اپنی مرضی کے موافق چلاتا ہے) اور زمانہ گردش فلک کا نام ہے جس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں۔ لہذا یہ سب مطیع ممدوح ہیں دیکھو کتنے شیریں الفاظ میں کہتا ہے:۔

ستارہ سجدہ کند طلعتِ منیر ترا   زمانہ بوسہ دہد پایۂ سریر ترا

وہاں خواب تھا۔ یہاں ادّعائے حقیقت ہے۔ پھر طلعت منیر کہکے حُسن کی طرف اشارہ کردیا جسکے ساتھ "یوسف" کا خیال آجانا لازم ہے۔ جیسے سخاوت کے ساتھ حاتم کا خیال آجاتا ہے۔ اور "منیر" کے معنے ہیں روشن کرنے والا۔ ایہام یہ ہے کہ شاید ستارہ اس وجہ سے سجدہ کررہا ہے کہ ممدوح کا حُسن روشنی بخشنے والا ہے۔ غرض عجیب لطف ہے جو بیان سے باہر ہے۔ مشکل ردیفیں ہوں یا آسان۔ زبان کا بادشاہ سب کو پانی کر دیتا ہے۔ ذرا چند شعر دیکھو:۔

ترا ست لعل شکر بار و در میان گوہر   میانِ لعل چرا کردہ نہان گوہر
(لب شیریں) (دنداں)
بخندہ چون لب یاقوت رنگ بکشائی   زشرم زرد شود ہمچو زعفران گوہر
اگرچہ سیم و زرم [نیست] ہست گوہر [نفس]   کہ نزد عقل بہ از صد ہزار کان گوہر
ہنر و کہ ننگ نیاید ترا ز صحبت من   چرا کہ ننگ ندارد ز ریسمان گوہر

یہ ردیف اور یہ روانی پھر فی البدیہہ طویل قصیدہ کہدینا کمال شاعری نہیں تو کیا ہے؟۔

دوسری بات ظہیر کے کلام میں یہ ہے کہ اسکے قصائد سرے سے اخیر تک یکساں ہوتے ہیں۔ انوری کے یہاں ظہیر کی سی ہمواری نہیں ہے۔ اگر بلند شعر ہے تو ظہیر کی رسائی وہاں تک دشوار اگر پست تو بالکل ہی پست۔ تیسری خصوصیت اسکے کلام کی یہ ہے کہ تخیل میں متاخرین کے لئے شاہ راہ کھول گیا ہے۔ ممکن ہے کہ انوری کے یہاں بھی یہ بات ہو مگر زبان اور عنوان ادا

یا ہمچو یونس آمدہ بیروں زبطن حوت | افتادہ بر کنارۂ دریا نحیف و زار
در معرضِ خلاف جہانے زمردو زن | تو یش در نظارۂ و خلقے در انتظار
من با خرد بحجرۂ خلوت شتافتم | گفتم کہ اے نتیجۂ الطاف کردگار
بازایں چہ نقشِ بو العجب و شکلِ نادر است | کز کارگاہِ غیب ہمی گردد آشکار ؟
آن شاہد از کجاست کہ ایں چرخ شوخ چشم | از گوشِ او بروں کشد ایں نغز گوشوار ؟
گردون زبازوے کہ در یدست ایں طراز ؟ | گیتی زساعدِ کہ ربودست ایں سوار ؟
گر جرمِ کوکب است چرا شد چنیں دوتاہ ؟ | ور پیکرِ مہ است چرا شد چنیں نزار ؟
گفت آنچہ بر شمردی ازیں جملہ ہیچ نیست | دانی کہ چیست یا تو بگویم بہ اختصار
نعلِ سمندِ شاہِ جہان است کاسمان | ہر ماہ بر سرش نہد از بہرِ افتخار

دیکھو! جو پرانی تشبیہیں ہیں آن کو نیا لباس محض حُسن ادا سے پہنا دیا ہے اور جو نئی ہیں وہ تو اپنے لئے مخصوص کر لے گیا ہے۔ ہر شعر کی لطافت بیان کرنے کے لئے تفصیل چاہیئے مگر کتاب مختصر ہے۔ اتنی گنجایش کہاں سے آئے ؟ غزل گوئی کے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ ایسا نازک خیال اور شیریں زبان اس صنف شعر کے لئے نہایت موزوں ہے مگر غزلیات ملتے نہیں اور جو غزلیں قصائد کے بعد کلیات مطبوعۂ منشی نولکشور لکھنؤ میں طبع ہوئی ہیں وہ اسکی ہیں نہیں۔ کوئی دوسرا شاعر ظہیر تخلص ہے جس نے بعض مقامات پر صائب کی شاگردی کا اقرار کیا ہے۔ لہٰذا اس صنف پر تنقید نہیں کی جاتی ہے۔

اب قصیدہ گویوں کا حال ختم کیا جاتا ہے (اگرچہ حسن[1] غزنوی۔ ادیب[2] صابر۔ سوزنی[3]۔ مجیر[4] بیلقانی۔ فلکی[5]۔ وغیرہ وغیرہ بکثرت شعرا ہیں جنکے حالات پر نظر رکھنا فن تاریخ و تنقید کے طالب کے لئے ضروری ہے) اور نظامی گنجوی کا حال لکھا جاتا ہے جس کا سکندر نامہ محیّر العقول ثابت ہوا ہے اور پروفیسر براؤن کی

کہیں کہیں شوخی بھی کر جاتے ہیں :-

بوسہ میخواہم ازاں لب تو چہ میفرمائی — گر صواب است بگو۔ ورنہ خطائے بکنم

فقر و سلوک کا رنگ مزاج میں غالب آگیا تھا بلکہ ابو الفرج زنجانی کے مرید بھی ہو گئے تھے اسلئے کہیں کہیں غزلوں میں یہ رنگ بھی نظر آتا ہے اور لطافت کے ساتھ :-

شبے تیرہ است و رہ مشکل جنیبت را عناں درکش
زمانے رخت ہستی را بخلوتگاہ جاں درکش
(روحانیت)
طریقش بے قدم می رو جمالش بے بصر می بین
(راہ عشق الٰہی) (اچنبا رہ ۱۲) (دیکھا کر)
کلامش بے زباں میخواں شرابش بے دہاں درکش
(پڑھا کر)

یہ بھی کیا خوب کہا ہے :-

عشق زحمت بر نتابد کاشنائے خلوت است
چوں تو با عشق آشنائی از ہمہ بیگانہ شو

قصائد میں سنائی کا رنگ غالب ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ نظامی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس صنعت سے امرا کی مدح سرائی کے بدنما داغ کو مٹا دیا اور عالم شعر میں ایک مثال قائم کر دی کہ اس سے بہت مفید کام لئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انکے قصائدِ موعظ و نصائح نہایت عمدہ نظم ہوئے ہیں اور بعض قطعات تو اس رنگ میں لاجواب ہیں۔ ذیل میں ایک قطعہ درج کیا جاتا ہے جسکے متعلق مولانا شبلی کا دعویٰ ہے کہ اس کا جواب آج تک نہ ہو سکا"

دوش رفتم بخرابات و مرا راہ نبود — میزدم نالہ و فریاد و کس از من نشنود
یا نبد ہیچکس از بادہ فروشاں بیدار — یا کہ من ہیچکس ام ہیچ کسم در نکشود
(بے حقیقت) (اسلئے امیر کیلئے کسی نے دروازہ کھولا)
پاسے از شب بگذشت[۱] بیشترک یا کمتر — رندے از غرفہ بروں کرد سر و رخ بنمود

۱؎ ایسے حرف موقوف کو تقطیع میں ساقط کرنا اس زمانے میں رائج تھا۔

بے گنہ از خانہ بروئم کشید | موے کشاں بر سر خونم کشید
(قتل کرنے کو لے چلا)

گفت فلاں نیم شب اے کوز پشت | بر سر کوے تو فلاں را کہ کشت
(کبڑی)

گر ندہی داد من اے شہریار | با تو رود روز شمار این شمار

چونکہ تو بیدادگری پروری | ترک نۂ۔ ہندوے غارتگری

شیریں و خسرو کو نظم کرکے عشقیہ شاعری کا راستہ کھولدیا۔ اگرچہ غزلیں پھیکی کہی ہیں مگر مثنوی میں تمام وہ مقامات نظم کردئے ہیں جو غزل کے لوازم سے ہیں اور نازک تشبیہوں اور استعاروں سے ایک لطف خاص پیدا کرکے اس صنف کی زبان کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ شیریں کے حسن کی تعریف میں یہ شعر دیکھو اور غزل گویوں کی زبان سے اسی مضموں کو سنو۔ خود کہدوگے کہ نظامی اس طرزِ ادا کا موجد ہے۔ شیریں نہانے جاتی ہے اور شاعر کہتا ہے :۔

چو قصدِ چشمہ کرد۔ آن چشمۂ نور | فلک را آب در چشم آمد از دور

شیریں چشمے کی طرف نہانے چلی۔ آسمان کو رنج ہوا کہ صحف آبی رنگ ہونا بیکار ہے کاش میں فی الحقیقت دریا ہوتا تو یہ لطف مجھے نصیب ہوتا۔ اس رنج کیوجہ سے آسماں کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ (آفتاب کے تھرّانے کی حسن تعلیل ہے۔ کیا یہ معنے بھی ممکن ہیں کہ آنکھ جب تیز روشنی کو دیکھتی ہے تو پانی بھر آتا ہے۔ آفتاب نے شیریں کو دیکھا تو یہ حال ہوگیا؟) :۔

پرندِ آسمان گون در میان زد | بشد در آب و آتش در جہان زد

آبی رنگ کی چادر لپیٹ کے پانی میں نہانے اُتری اور دنیا میں آگ لگادی۔ (اسوقت حسن میں جو دلفریبی پیدا ہوگئی تھی وہ دنیا کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا رہی تھی)۔

ایک مقام پہ شیریں کا بظاہر بگڑنا نظم کیا ہے مگر دل میں

کرنا چاہیئے۔ جب بادشاہ ہؤا تو ساتوں شہزادیوں سے ملا اور ہر ایک نے قصے
سنائے (مثنوی میں الف لیلہ کا مزا پیدا ہو گیا)۔ آخر میں بہرام کے انتقال کا حال
ہے اور مثنوی ختم ہے۔ اس مثنوی میں نظامی نے بہرام گور میں عربی اور عجمی
اخلاق کا مجموعہ دکھایا ہے کیونکہ اسکی ابتدائی تربیت عرب میں ہوئی تھی (غالباً
یہی وجہ تھی کہ قبل اسلام کی شاعری میں اس کا مصرعہ "نام بہرام مرا و پدرم بوجبلہ"[1]
عربی لفظ پر ختم ہے۔

آخری تصنیف سکندر نامہ ہے جسکی وجہ سے نظامی کو دنیائے شاعری
میں مثال بے مثالی حاصل ہوئی۔ اس مثنوی کے دو حصے ہیں بَرّی اور بحری۔ پہلا
حصہ رزمیہ ہے اور دوسرا مذہبی اور اخلاقی۔ خود سکندر کے متعلق کہتے ہیں :-

گروہے ہمیش خواند صاحب سریر ولایت ستاں بلکہ آفاق گیر
گروہے ز دیوان دستور راد بحکمت نوشتند منشور داد
گروہے ز پاکی و دین پروری پذیرا شدند حرفش بہ پیغمبری
من از ہر سہ دانہ کہ دانا فشاند درختے برومند خواہم نشاند

رزمیہ حصہ کے متعلق یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ شاہنامہ کے مقابلہ میں قطرے اور
دریا کی نسبت ہے مگر پھر بھی کچھ ایسے شان سے نظم ہو گیا کہ سکندر نامہ ختم ہوتے ہی
فارسی زبان میں رزمیہ شاعری کا کمال بھی ختم ہو گیا۔ سو برس کے بعد گوشہ نشین
نظامی کے دل میں امنگ ہوئی۔ زبان بدل چکی تھی۔ خیالات میں انقلاب
پیدا ہو گئے تھے۔ طرز ادا کی روش بدلنے کے خود ہی ذمہ دار تھے۔ لطیف استعارے
اور تشبیہیں زبان کے حظ کو بڑھا رہی تھیں صاف شفاف چشمے کا پانی پینے
والے برفاب اور قند آب کے جویا تھے۔ ایسے وقت میں سکندر نامہ کا

---

[1] یا اسکی مثنوی کا مصرعہ "نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ" دیکھو صفحہ ۱۸

چہ دستی کہ با ما درازی کنی | بتاج کیان دست بازی کنی
نگہدار دست کہ والا ستاین | نہ پنہان چو روز آشکار است این
زمین را منم تاج تارک نشیں | طرزان مرا تا تلرزد زمین
رہا کن کہ خواب خوشم می برد | زمین آب و چرخ آتشم می برد

اسکے بعد سکندر کی آہ وزاری ہے اور معذرت۔ پھر دارا کی وصیتیں ہیں جو سکندر نے سنیں اور منظور کیں۔ پھر دارا کی موت کو اسی سکون کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جتنی آسانی سے اُس کا دم اِن واقعات کے بعد نکلا ہوگا:-

سکندر پذیرفت از وہر چہ گفت | پذیرندہ برخاست گوئندہ خفت

مرنے کے بعد ہی ماتم شروع ہو جاتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون پہلے رویا۔ یہاں پر نظامی نے لطف بلاغت دکھایا ہے بجائے اوروں کے خود ہی مرثیہ شروع کر دیا:-

کبودی و کوری در آید بچرخ | کہ بغداد رکھیلے کاخ و کرخ
درخت کیاں را فرو ریخت بار | کفن دوخت بر دریع اسفندیار

نظامی کے شاعری پر مجموعی رائے ان الفاظ میں ہوسکتی ہے کہ زبان غیرمانوس اور ثقیل خالص فارسی سے پاک ہے۔ یعنے فردوسی کی طرح خالص فارسی کے دلدادہ ضرور ہیں مگر امتداد زمانہ نے جن الفاظ کو ٹکسال باہر کر دیا وہ انکے یہاں نہیں آسکتے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جس طرح ناسخ اُردو زبان کے ریفارمر ہوئے ہیں نظامی فارسی زبان کے تھے۔ علاوہ بریں طبیعت زور دار تھی اور واقعات میں زور بھر دینا انکے لئے معمولی بات تھی۔ اسی[1] غرض سے مختلف اسالیب بلاغت سے کام لیا ہے بلکہ جدید

---

[1] دیکھو صفحہ (۱۴۴) علم بر کشد اے آفتاب بلند الخ کہ محض خطاب کر کے کلام میں زور پیدا کر دیا۔

نثر کی کتابیں

شاہ مردان بن ابی الخیر نے اسی زمانے میں نزہت نامہ علائی نثر میں لکھا اور علاء الدین خاص بیگ والی طبرستان کو نذر کیا۔ ابوالمعالی محمد بن عبیداللہ کی تالیف بیان الادیان بھی یادگار ہے جس میں مختلف مذاہب کے حالات درج کئے ہیں اور گردیزی نے ایک کتاب زین الاخبار حالات خراسان میں لکھی ہے۔ کشف المحجوب جلابی مقالات تصوف میں اسی عہد کی تصنیف ہے اور نظامی[1] عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ تو اس قدر مقبول ہے کہ یورپ میں اسکے ترجمے ہو گئے ہیں۔

علاوہ بریں ذخیرۂ خوارزم شاہی ایک بیش بہا مجموعہ خوارزم شاہ کی یادگار ہے جسے علم طب کا انسائیکلوپیڈیا کہنا چاہئے۔ اور قاضی حمید الدین کی مقامات حمیدی نے ایک نیا اسلوب نثر نگاری حریری و بدیعی کے رنگ میں پیش کیا جو عرصے تک نظر قبول سے دیکھا گیا مگر بعد کو پایۂ اعتبار سے ساقط ہو گیا۔ ذیل میں چند سطریں نقل کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ چہار مقالہ اور سفرنامہ ناصر خسرو وغیرہ کی سادی اور بے تکلف نثر کو چھوڑ کے قاضی صاحب کس طرف چلے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انشائے عجم کو بھی لے چلے

---

[1] تاریخ ادب میں اسے نظامی عروضی کہا جاتا ہے تاکہ نظامی گنجوی سے جدا نظر آئے۔ اسکا نام نجم الدین احمد بن عمر بن علی ہے اور تخلص نظامی۔ کہتے ہیں کہ ویس و رامین کی داستان بھی اسی نے نظم کی تھی مگر یہ روایت تحقیقی نہیں ہے۔ اسکی کتاب چہار مقالہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۵۰۴ھ میں سمرقند میں تھا جہاں رودکی کے حالات سے اطلاع پائی۔ سنہ ۵۰۶ھ میں نیشاپور گیا اور عمر خیام کے فیض صحبت سے مستفیض ہوا۔ طوس میں جاکے فردوسی کی قبر کی زیارت کی اور اسکے حالات دریافت کئے۔ سنہ ۵۳۰ھ میں پھر نیشاپور گیا اور خیام کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ اسی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملک الجبال غوری کے دربار میں اسکی رسائی تھی اور وہاں سے انعامات وغیرہ بھی حاصل ہوئے تھے۔

باب ہشتم

تاتاریہ

محمد خوارزمشاہ

خوارزمشاہیوں کے تسلط کا حال سابق میں تحریر ہو چکا ہے علاء الدین محمد خوارزمشاہ کی ملک گیری کا شوق ایسا کامیاب ہوا کہ تھوڑے عرصے میں جبل قاف سے بحر فارس تک اور دریائے سندھ سے نہر فرات تک خوارزمشاہیوں کا ڈنکا بجنے لگا اور سب چھوٹی چھوٹی سلطنتیں مستہلک ہو گئیں۔ ناصر باللہ عباسی سے بھی عداوت ہو گئی تھی۔ دربار خلافت کیطرف سے غزنوی لوگ محمد خوارزم کی مخالفت پر آمادہ کئے جا رہے تھے اور محمد چاہتا تھا کہ سادات علوی میں سے ایک شخص کو خلیفہ بنا کے عباسیوں کا خاتمہ کر دے۔ اس زمانے میں تاتاریوں کو ملک گیری کا شوق ہوا اور اُن کے بادشاہ

چنگیز خاں

چنگیز خاں نے بُغرا کو دو مغلوں کے ساتھ محمد خوارزم کے دربار میں یہ پیام دیکے بھیجا کہ ایک والی نے چند تاجروں کو قتل کر ڈالا ہے لہذا اُسے تاتاریوں کے حوالے کیا جائے۔ خوارزم شاہ نے بُغرا کو قتل کر ڈالا اور مغلوں کو ذلیل کر کے نکلوا دیا۔ یہ ذلت مغلوں کی قُرلتائی (مجلس شورائے ملی) کو ناگوار ہوئی اور انتقام لینے کا جوش اتنا بڑھا کہ بخارا۔ نیشاپور۔ سمرقند۔ ترمذ اور مرو وغیرہ میں خون کی ندیاں بہا دیں اور مساجد و مقابر۔ مدارس و مساکن سب کو یوں کھود کے مسمار کر دیا کہ جن مقامات پر چہچہے اور قہقہے رہتے وہاں بجز زاغ و بوم کے کوئی بولنے والا نہ رہا اور جہاں سے تسبیح و تہلیل کی آوازیں بلند ہوتی تھیں وہاں

کیوک جنگ روس سے واپس آیا اور ایک عظیم الشان قرلتائی میں تخت نشین ہوا۔ جس میں سفرائے خلیفہ عباسی و شیخ الجبل کے علاوہ پاپائے روم کے سفیر بھی موجود تھے۔ اسکے زمانے میں عیسائیوں نے بیحد کوشش کی کہ تاتاری فوج عیسائیوں کے ساتھ مل کے مسلمانوں کا خاتمہ کردے بلکہ بغداد اور شیخ الجبل کے سفیروں کو ذلت کے ساتھ نکلوا بھی دیا مگر کوئی خاص کامیابی انکے ارادے کو نہ ہوئی اگرچہ یہ کوشش چنگیز خاں کے وقت سے جاری تھی اور مختلف ممالک مفتوحہ میں یورپ کے مشن کام کر رہے تھے۔

منگو

کیوک کا انتقال اپریل ۱۲۴۸ء میں ہوا اور منگو خاں بادشاہ ہوا جسکی باضابطہ تخت نشینی یکم جولائی ۱۲۵۱ء کو ہوئی۔ اُسنے اپنے بھائی قبلا خاں کو تسخیر چین کے لئے اور دوسرے بھائی ہلاکو خاں کو خلافت بغداد اور اسمٰعیلیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ قبلا خاں کو چین کی تسخیر میں عظیم الشان کامیابی ہوئی اور ہلاکو نے پانچسو برس کی قائم خلافت عباسیہ کو اور ڈیڑھ سو برس کی تحریک اسمٰعیلیت کو ایسی بے دردی سے تہ تیغ کیا جس کی مثال تاریخ عالم میں شاید فترت چنگیزی ہی ہو سکتی ہے۔ الموت کا مذہبی دور ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اور دارالسلام بغداد میں تو سنہ ۶۵۶ھ (مطابق ۱۲۵۸ء) میں وہ تباہی آئی کہ پھر نہ سنبھلا اور آخری خلیفہ مستعصم باللہ کی زندگی کا خاتمہ نہایت عبرت ناک طریقہ سے ہوا۔ عجب اتفاق ہے کہ ایسے خونریز بادشاہ کے ہمراہ رکاب عطا ملک جوینی محقق طوسی۔ اتابک ابوبکر بن سعد زنگی (سعدی کا ممدوح) اور اتابک بدرالدین لولوی موصلی سے نامبرآوردہ لوگ تھے۔ غرض اس انقلاب عظیم نے تاریخ کا دوسرا صفحہ شروع کردیا۔ یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ ہیبت ناک منظر اپنے ساتھ انشائے عجم کے لئے روح تازہ لئے ہوئے آتا ہے اور اس خونریز قوم کی حکومت میں فنون جنگ کے اصول شائع ہونگے۔ ہیئت و ہندسہ منطق و فلسفہ۔ کلام و تاریخ پر بے نظیر کتابیں نکلیں گی۔ فاتحوں کی وسیع سلطنت چینیوں کو بلاد روم و روس میں اور مغلوں کو اقصائے ہند و یمن تک پھیلا کے آپس میں تبادلۂ خیالات و

ہلاکو

درنگرائے چراغِ جہان گشتہ | تا بہ بلخی دو صد جہان گشتہ
کشتگانِ زندگان جاویدانند | خاصہ در دستِ کافران گشتہ

ارغون لامذہب تھا مگر مسلمانوں کا سخت دشمن۔ اس نے ایک یہودی سعد الدولہ کو اپنا وزیر مقرر کیا جس نے اکابر اسلام کو تہ تیغ کیا اور شعائر اسلام کو بالکل مٹا دیا۔ آخر ۶۹۰ھ (مطابق ۱۲۹۱ء) بادشاہ و وزیر دونوں ختم ہوگئے اور اس کا بھائی گیخاتو

گیخاتو

تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت نیک بخت تھا مگر فضول خرچ۔ اس کا وزیر صدر جہاں بھی نہایت مدبر تھا سیم و زر کی قلت سے مجبور ہو کے کاغذ کا سکہ (نوٹ) جاری کیا جس کا ۶۹۳ھ مطابق ۱۲۹۴ء میں نام چاؤ تھا اور اس نے اعلان کیا کہ۔

چاؤ اگر در جہان روان گردد | رونقِ ملک جاودان گردد

لیکن تاجروں نے اس اختراع کو پسند نہ کیا اور مجبوراً پھر طلائی اور نقرئی سکے جاری ہوئے جس سے اور شدید نقصان ہوا اور صرف ایک لفظ (چاؤ) کا فارسی زبان میں اضافہ ہوگیا۔ اس بادشاہ کا خاتمہ اپنے چچا زاد بھائی بائدو کے ہاتھوں روز پنجشنبہ ۶ جمادی الآخری ۶۹۴ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۲۹۵ء کو ہوا جسے وہ نشہ میں بہت ذلیل کر چکا تھا۔ جمادی الاخری ۶۹۴ھ (اکتوبر) سے چھ ماہ تک اسکی حکومت رہی آخر نتیجہ میں یہ بھی غازان بن ارغون کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

بائدو

غازان

غازان کی تاریخ ولادت ۲ دسمبر ۱۲۷۱ء ہے اور اس کا نام اس سلسلہ سلاطین میں سونے کے حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ اسکے زمانے میں استقلال اسلام ممالک ایران میں ہوگیا اور آشوب تاتار یہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوا۔ خود بھی عربی و فارسی۔ چینی و تبتی و کشمیری بلکہ لاطین بھی جانتا تھا اور ترویج علوم کا ایسا شوق تھا کہ کملائے عصر کو اپنے تصانیف بیش بہا پیش کرنے کا موقع ملا۔ اسی نے خاقان چین کی ماتحتی ترک کر کے خود مختار حکومت قائم کی اور مشاہد مقدسہ

رُخ پھر بدل دیا۔ یہ بھی عجب اتفاق ہے کہ تیمور کا سنہ ولادت اور ابوسعید کا سنہ وفات ایک ہی ہے۔ ان لوگوں کا شجرۂ خاندان یہ ہے :۔

چنگیز خاں

اگتائی خاں — تولائی

کیوک

قبلائی — ہلاکو — منگو

اباقہ — احمد نکودار

گیخاتو — ارغون

غازان — الجائتو خاں

ابوسعید
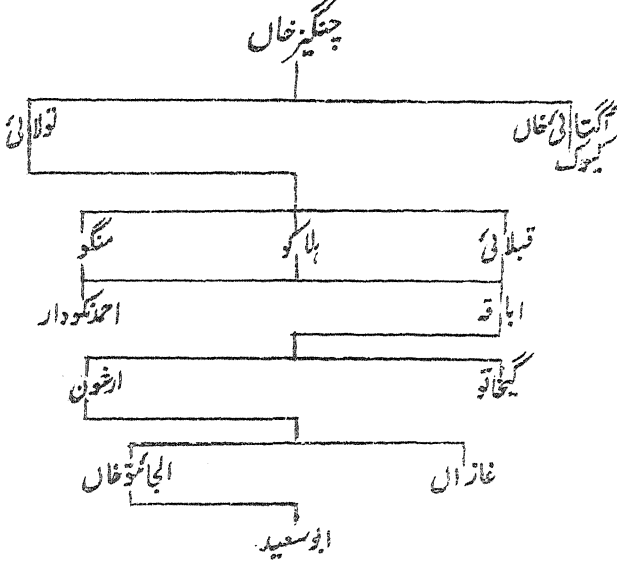
اب ہم اس عہد[۱] کے تصانیف کا حال لکھتے ہیں۔ عربی میں تفسیر بیضاوی۔ فصوص الحکم ابن عربی طبقات الاطبا۔ کامل ابن اثیر۔ وفیات ابن خلکان۔ آثار البلاد وغیرہ بے نظیر کتابیں آج تک ثابت کر رہی ہیں کہ اسلامی علوم کا رُخ کس ترقی کیطرف جا رہا تھا اور فارسی میں تو ایسے بیش بہا تصانیف ہوے کہ شاید و باید۔

عطا ملک جوینی

علاء الملک عطا ملک جوینی نے چنگیز خاں کے فتوحات کا حال قلمبند کیا اور تاریخ جہانکشا نام رکھکے سنہ ۶۵۸ھ مطابق سنہ ۱۲۶۰ء میں علمی دنیا کو پیشکش کیا ہے کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ چنگیز خاں اور اُسکے اسلاف و اخلاف کی

---

[۱] اسی زمانے میں ہندوستان میں فارسی زبان میں طبقات ناصری اور تاریخ فیروز شاہی وغیرہ تصنیف ہو رہی تھیں جنکا ذکر ایک علحدہ باب میں آئے گا۔

لکھی ہے مگر انکا قول یہ تھا کہ سعدی اپنا ایک فقرہ[1] گلستان کا مجھے دیدے اور ساری تصنیف میری خود دے لے۔ پروفیسر براؤن نے اسکے اخلاقی تعلیم کے معیار کو پست ظاہر کیا ہے اور "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" یا اور ایسی ہی دو ایک ہدایتوں سے استشہاد کیا ہے حالانکہ میدان عمل میں آکے کمال اخلاق کے مدعی اس سے بدتر نظر آتے ہیں مگر سعدی نے سچی بات کہدی اور انسان کی اخلاقی قوت کے حدود کو بتا دیا ورنہ اگر اس ہدایت پر خود عمل کر لیتے تو شاید اعتراضات کے دروازے بند ہو جاتے۔

محقق طوسی

محقق طوسی نے اخلاق ناصری علم اخلاق میں اور معیار الاشعار فن عروض میں تصنیف کیں محقق موصوف کا نام نصیر الدین محمد بن حسن ہے اور طوس مقام پیدایش و نشو ونما او سال ولادت ۵۹۷ھ فلسفہ و ریاضی میں بےنظیر تھے اور فقہ و حدیث و تفسیر وغیرہ میں بھی کامل الفن۔ بلکہ ان کے لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اس جامعیت کے علما دنیائے اسلام میں کم نظر آتے ہیں۔ ابتدائی زمانہ قلاع اسمعیلیہ میں گذرا بلکہ شاید وہیں قید بھی رہے۔ ایلخانی فتوحات انکی رہائی کا باعث ہوئیں اور ہلاکو خاں اور اُسکے وارثوں کے یہاں وزارت کے عہدے تک پہونچے۔ آخر جون ۶۷۲ھ میں رحلت کی اور کاظمین (بغداد) میں دفن ہوئے بعض ناقدین کی رائے ہے کہ "از زمان اوائل الآن نہایت مرتبۂ فضل فضلائے عمدۂ تصنیفات کتب او انحصار دارد" یہاں بھی وہی چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں مگر تراکیب و محاورات عرب کی کثرت ہے لیکن قوت علمیہ نے طرز ادا میں

---

[1] وہ فقرہ یہ ہے "از بستر نرمش بخاک سر گرمش نشاندند" ایک شہزادے کی حالت ہے اور صنعت تقابل ایک دلکش اور روح پرور منظر ہے ایک عبرتناک اور درد انگیز وادی تک اس قدر تعجیل سے خیال کو کھینچ کے لائی ہے کہ ادیب کی طبیعت تنگ ہو جاتی ہے۔

دریا رغو[1] حاضر گشت۔ جواب درست درشت بے دہشت وکان[2] منہ العفو کل بالجبل دہشت عرضہ داشت کہ آنروز گیخاتو خاں بر تخت خانیت متمکن بود۔ اگر بر قتل اقدام نمودے امتثال واجب بودے۔ اجمام[3] ناممکن۔ امروز نیز بندہ بادشاہم اگر سیکورغامشی[4] فرماید و بر بندۂ خود ہم جائے منت نہد با ہر کہ اشارہ رود انقیاد ہماں واجب دانم۔"

رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ بھی ایک یادگار کتاب ہے۔ مصنف کی تاریخ ولادت ۶۴۲ھ ہے اور وطن ہمدان۔ ابتدائی زمانہ اہل علم کی صحبت میں گذرا۔ غازان کے عہد حکومت میں وزارت پائی اور وصاف کی تقریب دربار شاہی میں کی۔ الجائتو کے وقت میں بھی وزیر رہا۔ آخر درانداز وں نے بادشاہ کو ناراض کر دیا اور ستر برس کی عمر پا کے ۷۱۶ھ (۱۳۱۸ء) میں قتل کیا گیا۔ عمارات میں ربع رشیدیہ اور اپنا مقبرہ چھوڑا تھا مگر گردش زمانہ نے انھیں بھی باقی نہ رکھا۔ جامع التواریخ اسکی بہترین یادگار ہے۔

رشید الدین فضل اللہ

پہلی جلد میں مغلوں اور تاتاریوں کے حالات۔ انکے خاندانی شجرے قصص و روایات و تقسیم قبائل وغیرہ کا ذکر ہے پھر چنگیز خاں اور اسکے اسلاف و اخلاف کی (غازان خان تک) تاریخ ہے۔ دوسری جلد میں حضرت ابوالبشر سے لیکے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے حالات ہیں اور سلاطین ایران کا بھی عہد اسلام تک ذکر کیا گیا ہے۔ اسکے بعد حالات خلفائے بنی امیہ و بنی عباس قلمبند کئے ہیں۔ پھر سلاجقہ و سلغریہ و اسمٰعیلیہ وغیرہ کے حالات ہیں آخر میں چینیوں۔ یہودیوں۔ نصرانیوں اور ہندؤں کے اذکار ہیں بلکہ سکیامنی (گوتم بدھ) کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ زبان سلیس اور شستہ ہے

---

[1] مواخذہ۔ [2] گویا کہ اس سے عقلیں بیحد دہشت کھا گئیں۔ [3] آرام کرنا۔ [4] مہربانی

بمسجد مغل اندر آتش فگند زبانہ برآمد بہ چرخ بلند

بآتش سقوف و مقرنس بسوخت وزاں کفر جور و ستم بر فروخت

کہتے ہیں کہ ۷۵۰۰۰ شعر کی مثنوی ہے۔ ۲۵ ہزار شعر عرب کے حال میں، بیس ہزار عجم کی تاریخ اور تیس ہزار تاتاریوں کے فتوحات وغیرہ کے ذکر میں ہیں۔ شاعری کے اعتبار سے بجز سادہ بیانی کے اور کس بات کی داد دی جاسکتی ہے۔

نزہت القلوب — اسکے بعد نزہت القلوب پانچ سال بعد تصنیف کی۔ جسے فارسی زبان کا قدیم ترین جغرافیہ کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ بناکتی — تاریخ بناکتی کو فخر الدین بناکتی نے نہایت شیریں اور سلیس فارسی میں لکھ کے ۷۱۷ھ ۱۳۱۷ء میں شائع کیا۔ پروفیسر براؤن اسکی تاریخی معلومات کی بہت تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "علاوہ تاریخ اسلام و تاتاریہ و عجم کے صحیح معلومات بہم پہنچانے کے مصنف نے جزائر برطانیہ و فرانس و روس و پرتگال وغیرہ کی بھی صحیح تاریخ بلکہ رومۃ الکبریٰ اور تاریخ مذہب مسیحی کے صحیح روایات نقل کئے ہیں اور یہ بات مسلمان مورخوں میں بہت شاذ و نادر ہے"۔ اسی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل چین چھاپنے کا فن بخوبی جانتے تھے اور تختیوں پر ابھرے ہوئے حروف میں کتابوں کے صفحات تیار کر کے جمع کر لیتے تھے اور جس طرح مہر لگاتے ہیں اسی طرح جب کسی نسخے کی ضرورت ہوتی تھی تو چھاپ کے دیدیتے تھے۔

علامہ قطب الدین شیرازی محقق طوسی کے شاگرد رشید تھے انھوں نے

درۃ التاج — فارسی میں درۃ التاج تصنیف کی جس میں تمام اجزائے فلسفہ کی مکمل بحث موجود ہے۔ اسی طرح اور کاملین نے نایاب کتابیں لکھی ہیں جن کی تفصیل بخوف طول ترک کیجاتی ہے۔

طاری ہوئی اور وہ کان راہِ خدا میں لٹا دی اور کاروبار چھوڑ کے فقیر ہو گئے قصّہ ممکن ہے کہ آخر عمر میں پیش آیا ہو ورنہ بیشتر تصانیف آپکے دواخانے ہی میں ہوئے ہیں۔ ایک مثنوی میں اپنی سیاحی کا حال لکھتے ہیں :۔

سر برآوردہ بہ مجبوبی عشق   سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق

کوفہ و رے تا خراساں گشتہ ام   سیحُن و جیحونش را ببریدہ ام

ملک ہندوستان و ترکستاں زمین   رفتہ چوں اہل خطا از سوی چین

در نشاپورم بہ کنجِ خلوتے   با خدائے خویش کردم وحدتے

ان کی بیش بہا زندگی کا خاتمہ اپنے وطن نیشاپور میں ایک مغل کی تلوار سے ۶۲۷ھ (مطابق ۱۲۲۹ء) میں ہوا اور تقریباً ۱۱۴ برس کی دیھما پال [?] قمری عمر پائی۔ تصانیف میں منطق الطیر اور پندنامہ کے علاوہ اسرار نامہ۔ الٰہی نامہ۔ مصیبت نامہ۔ وصیت نامہ۔ بلبل نامہ۔ حیدر نامہ۔ گل و ہرمز۔ سیاہ نامہ۔ مختار نامہ وغیرہ بھی ہیں۔ دقائقِ تصوّف اس حد کے بیان نہیں کئے ہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں اور زبان کی صفائی تو اس قدر ہے کہ گویا یہ صفت ان پر ختم ہو گئی اگرچہ پرانے تلفظ اور محاورات بھی شامل ہیں۔ قوت تخیل سے پرانے مضامین کو نیا جامہ پہنا کے بیحد زوردار کر دیا ہے :۔

می پنداری کہ جاں توانی دیدن   اسرار ہمہ جہاں توانی دیدن

ہر گاہ کہ بینشِ تو گردد بکمال   کوری خود آں زماں توانی دیدن

خواجہ صاحب کی معرفت کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا :۔

روزہ حفظِ دل است از خطرات   پس بود با مشاہدہ افطار

حج چہ باشد زخود سفر کردن   بکجا ؟ جانب ہدایت کار

وحی چہ آمدہ ہر آنچہ در دل تو   سر زند از نتائج اسرار

کمال اسمٰعیل

خلاق المعانی کمال الدین محمد اسمٰعیل پسر جمال الدین عبدالرزاق اصفہانی۔ تخلص کمال۔ باپ بیٹے دونوں شاعر تھے۔ علمی اعتبار سے فضیلت کا درجہ حاصل تھا اور خاندانی حیثیت میں بھی با اثر تھے۔ اصفہان کے قاضیوں کے خاندان صاعدیہ کی مدح کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ سلاطین کو چھوڑ کے قاضیوں کی مدح سرائی کیوں کرتے ہو۔ کہا یہ لوگ سخن فہم ہیں حالانکہ سلطان سنجر وغیرہ کی تعریف بھی کبھی کبھی کی ہے۔ ۶۳۵ھ میں اکتائی قاآن نے اصفہان میں قتل عام کا حکم دیا۔ شہر لوٹا گیا مگر اس گوشہ نشین شاعر سے کوئی نہ بولا بلکہ لوگ امانتیں لا کے اُن کے کنوئیں میں محفوظ کر دیتے تھے۔ اتفاقاً ایک ترک بچہ ادھر نکل آیا اور ایک پرندکو غلیل سے مارنا چاہا۔ زہ گیر کنوئیں میں گر گئی۔ وہ اترا تو پورا خزانہ پایا سب لے لیا اور کمال سے پوچھا اور مال کہاں ہے۔ وہاں کیا تھا جو دیتے۔ آخر ظالم نے شاعر کی جان لی اور شکنجہ میں کس کے مار ڈالا۔ ریاض الشعرا میں ایک رباعی اس اخیر وقت کی لکھی ہے:۔

این کشتۂ نگر کمال اسمٰعیل است   قربان شدنش نہ از رہِ تجیل است
قربانِ تو شد کمال اندر رہِ عشق   قربان شدن از کمالِ اسمٰعیل است

شاعری میں اسلاف کی استواری اور اخلاف کی نزاکت اور مضمون آفرینی دونوں کو جمع کیا ہے یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین سب ان کے معترف ہیں۔ حافظ کہتے ہیں:۔

گر باورت نمی‌شود از بندہ این حدیث   از گفتۂ کمال دلیلے بیاورم

حزیں کا فیصلہ باپ بیٹے کی شاعری میں یہ ہے:۔

در شعر جمال ارچہ جمالے بہ کمال است   آنانہ بزیبائیِ افکارِ کمال است
دریوزہ گر رشحۂ او یند حریفاں   الحق رگِ ابرِ قلمش بحرِ نوال است

رُباعی میں جسقدر ترقی کی ہے قدما کے یہاں نہیں :-

گل خواست کہ چوں رخش نکو باشد و نیست   چوں دلبر من برنگ و بو باشد و نیست
صد روسے فراہم آورد در سالے   باشد کہ یکے چو روے او باشد و نیست

مولانا روم — جلال الدین محمد بن بہاء الدین محمد بن الحسین البکری عرف مولانا روم

سال ولادت سنہ ۶۰۴ھ مطابق ۱۲۰۷ء ہے اور مولد بلخ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی جن کا آستانہ سلطان محمد خوارزم شاہ کے زمانے میں طالبان حقیقت کا مرجع تھا۔ کہتے ہیں کہ اس مرجعیت پر سلطان کو حسد ہوا اور امام رازی کے اُبھارنے سے مولانا سے ناراضی کا اظہار کیا۔ وہ بھی کبیدہ خاطر ہو گئے اور بلخ سے نیشاپور چلے گئے (سنہ ۶۱۰ھ مطابق ۱۲۱۳ء) یہاں شیخ فریدالدین عطار سے ملاقات ہوئی مولانا روم اُسوقت کمسن تھے۔ صاحب زادے کو ہونہار دیکھ کے اُنھوں نے اپنا اسرار نامہ عطا کیا اور باپ سے کہا "زود باشد کہ ایں پسر آتش در سوختگان عالم زند" پھر مولانا بہاء الدین بغداد چلے گئے اور وہاں سے زیارت حرمین شریفین و سفر بیت المقدس کر کے زنجان آئے اور پھر آق شہر اور لارندہ ہوتے پہنچے۔ یہاں مولانا روم کی شادی کی۔ لارندہ سے علاء الدین[2] کیقباد نے قونیہ بلایا اور یہیں انکی وفات (سنہ ۶۲۳ھ) میں ہوئی بعض کا

---

[1] انکے تفصیلی حالات اور کلام کی کامل تنقید کے لیے مولانا شبلی کی سوانح مولوی روم سے بہتر کتاب ملنا مشکل ہے۔

[2] سلجوقیوں کی تیسری شاخ کا بادشاہ قتلمش (دیکھیے صفحہ ۱۱۰) کی اولاد میں تھا۔ ۲۲۰ سال تک ان لوگوں کی سلطنت ایشیائے کوچک پر رہی جنھیں اس زمانے میں سلاجقہ روم کہتے تھے اور مولوی روم کا لقب اسی ملک میں توطن کی وجہ سے ہوا۔ اس علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا غیاث الدین کیخسرو بادشاہ ہوا اور سنہ ۶۵۴ھ میں مر گیا۔ اسکے تین بیٹے تھے۔ علاء الدین کیقباد۔ عز الدین کیکاؤس۔ رکن الدین قلیج ارسلان۔ پہلے دو بھائی یکے بعد دیگرے قونیہ کے حاکم رہے لیکن سنہ ۶۵۹ھ میں تاتاریوں کے پھیر میں آکے سارا خاندان ختم ہو گیا۔ معین الدین پروانہ مولانا روم کا شاگرد اور پسر خواندہ رکن الدین قلیج ارسلان کا حاجب تھا۔

بھی قائم ہوگیا۔ صلاح الدین کے انتقال (سنہ ۶۶۴ھ) کے بعد اپنے مرید
حسام الدین چلپی کو ہمراز بنایا۔ انکو اپنی مثنوی میں بھی اکثر یاد کیا ہے :۔

ای ضیاء الحق حسام الدین بیار   این سوم دفتر کہ سنت شد سہ بار

مدتے این مثنوی تاخیر شد   سالہا بایست تا خون شیر شد

آخر سنہ ۶۷۲ھ (مطابق سنہ ۱۲۷۳ء) میں انتقال ہوگیا اور حسام الدین انکے خلیفہ ہوئے۔ انکے بعد
مولانا کے بیٹے سلطان ولد سجادہ نشین ہوئے اور انکے مریدوں کا فرقہ جلالیہ
کہلایا۔ بعد کو یہ لوگ مولویہ کہلانے لگے۔ رقص و سماع اس فرقے کے لئے مخصوص
ہیں۔ کلام کی تنقید سوء ادب ہے خصوصاً مثنوی جو اس وقت تک
مقبول اخلاقی ہے۔ کسی نے کہا ہے :۔

مثنوی مولوی معنوی   ہست قرآں در زبان پہلوی

من چگویم کہ آں عالیجناب   ہست پیغمبر ولے دارد کتاب

صاحب آتشکدہ کے نزدیک اس مثنوی میں "عین الیقین کو بواسطہ علم الیقین
مرتبہ عیانی تک پہونچا دیا" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اسرار معارف و رموز حقائق کو
جس جذب کامل و جوش سرمستی کے عالم میں مولانا نے نظم کیا ہے اس کا جواب تاریخ
عالم میں نہیں ملتا۔ صاحب مجمع الفصحا کی رائے بھی یہی ہے کہ "دنیا نے شعر میں
شاہنامہ اور مثنوی ایسی بے نظیر کتابیں ہیں جنکا جواب ناممکن ہے" (دیکھو صفحہ ۹۴)
اکثر مقبول کتابوں کے متعلق دیکھا ہے کہ عام فہم اور سلیس ہونیکی وجہ سے مشہور
ہوئیں پھر خواص کو التفات ہوا اور اگر قابل قبول ہوئی تو مقبول خاص و عام ہو گئی
واقعاً مثنوی میں اسقدر دقیق باتیں ہیں کہ خاص لوگ بھی مشکل سے سمجھتے ہیں
مگر پھر بھی شہرت اور مقبولیت ایسی ہے کہ حد نہیں۔ خدا جانے اس میں کیا راز
ہے؟ اس کتاب کی تصنیف حسام الدین چلپی کی فرمایشوں کی وجہ سے دس برس

مرید ہوئے پھر ہند و شام و بلقان ہوتے ہوئے بلاد روم میں پہونچے جہاں مولانا روم سے ملاقات ہوئی (امیر خسرو سے ہند میں ملاقات ثابت نہیں۔ ہاں اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امیر صاحب کا کلام سن کے پسند کیا تھا)۔ فترت تاتاریہ کے زمانے میں خواجہ شمس الدین جوینی اور علاء الدین جوینی ان کے بڑے قدرداں تھے اور اباقہ (اباقا آن خاں) تک رسائی بھی انھیں کی وجہ سے ہوئی بلکہ آزاد ملتی ہے ان کی شان اُس دربار میں بہت بڑھادی تھی۔ بادشاہ نے اشعار سننا چاہے تو آپنے کہا:۔

شہے کہ حفظ رعیت نگاہ می دارد	حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی است
دگرنہ راعی خلق است زہر مارش باد	کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی است

بادشاہ نے بار بار پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ آپ ہیں تو پہلا شعر حسب حال ہے ورنہ دوسرا (شعر العجم جلد دوم)۔ آخر عمر میں شیخ نے زاویہ نشینی اختیار کرلی اور ارغون خاں کے زمانے میں ۱۰۲ برس کی عمر پاکے ۶۹۱ھ (مطابق ۱۲۹۲ء) میں انتقال کیا۔ ایک مقام لکھنا نام تھا وہاں مزار بنا جو سعدیہ کہلاتا ہے اور زیارت گاہ عجم ہے۔

شیخ کے تصانیف میں گلستاں کا ذکر ہو چکا ہے جو صاحب مجمع الفصحا کے نزدیک فارسی لٹریچر کی چار نایاب کتابوں میں ہے (باقی تین کتابیں شاہنامہ مثنوی مولانا روم اور دیوانِ حافظ ہیں) بلکہ نثر میں بھی تنہا کتاب بے نظیر ہے۔ اسکی شیرینی ادا اور لطف بیان نے اُدبائے یورپ کو بھی تسخیر کرلیا ہے چنانچہ پروفیسر ویمبری۔ سر گور اوسلی۔ سر ایڈون آرنلڈ وغیرہ اسکی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ بوستاں ایک مثنوی ہے جس کی سادگی توصیف سے بالاتر ہے بلکہ سہل ممتنع کی نظم میں اگر مثال ہے تو یہی۔ بچے سے لیکے بوڑھے تک ان دونوں کتابوں کو بلاد اسلامیہ و غیر اسلامیہ میں پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ فلسفۂ اخلاق کے مفید مسائل ایسے

یا فطرت انسانی کے مقتضیات کے بالکل خلاف جاتی ہیں۔ یہ کامل تعلیم اس وجہ سے ہے کہ شیخ نے حدیث[۱] و تفسیر وغیرہ کو بھی سمجھ لیا تھا اور اُسکے فیض سے جو اثر پایا ہے اُسی سے اپنے کلام کو موثر بنایا ہے۔ بیشتر احادیث حضرت رسولؐ اور کلمات علی بن ابی طالب علیہ السلام و ائمہ کبار کے لفظی ترجمے کر دئے ہیں جن کی نورانیت نے شیخ کے کلام کو ابدی جلوہ دیدیا ہے بلکہ جس مقام پر اِن تعلیمات قدسیہ سے ہٹ گئے ہیں اور اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں وہاں مورد اعتراض بھی ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

زنِ نو کن اے دوست در ہر بہار ۔۔۔ کہ تقویم پارینہ ناید بکار

شیخ کی نظر معمولی واقعات پر عارفانہ پڑتی ہے اور دنیا کی ہر چیز سے ایک عبرت کا سبق حاصل کرتے ہیں :۔ اپنے بچپن کا حال لکھا ہے :۔

بدر کرد نا گہ یکے مشتری ۔۔۔ بشیرینی از دستم انگشتری

چو نشناسد انگشتری طفل خرد ۔۔۔ بشیرینی از وے تواند برد

تو ہم قیمت عمر نشناختی ۔۔۔ کہ در عیش شیریں بر انداختی

ایک مقام پر کہتے ہیں :۔

زدم تیشہ یک روز بر تلِّ خاک ۔۔۔ بگوش آمدم نالۂ دردناک

کہ زنہار اگر مردی۔ آہستہ تر! ۔۔۔ کہ چشم و بنا گوش و روی است و سر

قصائد و قطعات کی بھی یہی حالت ہے کہ مواعظ و نصائح کا سرچشمہ بنے ہوئے ہیں اور لطف ادا اور فصاحت خداداد کا سچا نمونہ۔ کہیں کہیں مناظر قدرت کی تصویریں کھینچی ہیں اور وہ بھی سچی :۔

---

[۱] تعجب ہے کہ باوجود اس فضل و کمال کے اکثر حدیثیں ضعیف اور موضوع بھی نقل کر دی ہیں اور تاریخی غلطیاں بھی گلستان و بوستاں میں نظر آتی ہیں۔

طبیعت میں سوز و گداز بھر دیا تھا۔ عالم حقیقت میں آئے تو وہ شعلے اور تیز ہو گئے۔ موسم بہار میں بلبل کے نغمے سننے اور بیچین ہو گئے۔ منہ سے نکل گیا :۔

خبرِ ما برسانید بمرغانِ چمن　　　　که ہم آوازِ شما در قفسے اُفتاد است

کبھی اپنی بیتی یوں سناتے ہیں :۔

سعدیا نوبتِ امشب دُہلِ صبح نکوفت　　　　یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

اور سنئے :۔

سعدیا این ہمہ فریاد تو بے چیزے نیست　　　　آتشے ہست کہ دود از سرِ آن می آید

پچھلے شاعروں کی غزل میں یہ سوز گداز کہاں سے آتا؟ شیخ پر جو گذری وہ اُن پر کب گذری؟ سنو! کیا کہتے ہیں :۔

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر　　　　بہ سر نکوفتہ باشد درِ سرائے را

اس سرائے کی تنکیر کا لطف دیکھنا! اگر معشوق یا دوست کہدیتے تو یہ بات نہ رہتی۔ اُن کو تو بعض وقت یہ بھی کہتے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں جورِ محبوب سے فریاد کرتا ہوں۔ جس عالم میں خود ہیں وہاں ظالم و مظلوم کے درمیان اتنا اتحاد ہے کہ دوئی کو راہ نہیں۔ جو معشوق کے جور و جفا کے شکوہ پرداز ہیں وہ فنا فی المعشوق نہیں ہوئے :۔

ہمہ از دستِ غیر نالہ کنند　　　　سعدی از دستِ خویشتن فریاد

سچ یہ ہے کہ غزل کی پیغمبری انھیں کے لئے ہے (دیکھو صفحہ ۹۳) طول کا خوف اگر نہ ہوتا تو جی بھر کے لکھتا۔ تبرکاً چند شعر اور لکھے جاتے ہیں :۔

بمن این نظر حرام است و بسے گناہ دارم
چہ کنم نمی توانم کہ نظر نگاہ دارم

---

۵۹ اگلے زمانہیں پانچوں وقت نوبت بجتی تھی اب بھی حسین آباد مبارک (لکھنؤ) میں صبح و شام نوبت بجتی ہے۔

اور تعلیم کو قوی یوں کر دیا:۔

مرا باشد از دردِ طفلاں خبر   کہ در طفلی از سر برفتم پدر
(از سرِ من برفت)

رباعیاں بیشتر وعظیہ ہیں اور خوب ہیں :۔

دورانِ بقا چو بادِ صحرا بگذشت   تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت

پنداشت ستمگر کہ جفا بر ما کرد   بر گردنِ او بماند و بر ما بگذشت

قانعی   قانعی طوسی تاتاریوں کی شورش سے خوف زدہ ہو کر ہندوستان چلا گیا اور وہاں سے عدن ہوتا ہوا حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوا پھر بغداد گیا اور وہاں سے قونیہ پہونچا سلجوق روم کی بارگاہ میں رسائی ہوئی اور خطاب ملک الشعرائی پایا مولانا روم کا مرثیہ اس نے نظم کیا ہے کہتے ہیں اس کے دیوان میں تین لاکھ شعر تھے۔

پور بہائے جامی   پور بہائے جامی صاحب دیوان شمس الدین جوینی کا شاعر تھا۔ زلزلۂ نیشاپور کے حال میں ایک مشہور قصیدہ یادگار ہے۔ لیکن شاعرانہ اعتبار سے کوئی خاص بات اُس میں نہیں جو نقل کیا جائے۔ کسی کا ایک دانت ٹوٹ گیا تھا۔ تسلّی کے لئے یہ رباعی کہدی :۔

گر شد گہرے ز درج نوشینت کم   در حسن نگشت ہیچ تمکینت کم

صد ماہ ز اطرافِ رخت پیدا باد   گو باش ستارۂ ز پروینت کم!

امامی ہروی   امامی ہروی! ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن عثمان المتوفی ۶۶۷ھ (مطابق ۶۹–۱۲۶۸ء) اتابکانِ فارس کے شعرا میں سربلند تھا۔ مجد الدین ہمگر سے پوچھا گیا کہ سعدی اور امامی دونوں میں کون بہتر شاعر ہے۔ جواب دیا :۔

ما گرچہ بنطق طوطیِ خوش نفسیم   بر شکر گفتہ ہای سعدی مگسیم

در شیوۂ شاعری باجماعِ امم   ہرگز من و سعدی بامامی نرسیم

فزود رونقِ بُستانِ عارضت کامسال　　بنفشہ سایہ براطراف ارغواں انداخت

یہ تشبیب ایک بہترین قصیدے کی ہے جس میں اظہار تغزل کیا گیا ہے۔ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ بعض فحش ہیں بعض صاف۔ مذاق طبیعت کا اندازہ اس رباعی سے ہوگا:۔

در عشق تو کس تاب نیارد جز من　　در شورہ کسے تخم نکارد جز من

با دشمن و با دوست بدت میگویم　　تا ہیچکست دوست ندارد جز من

بہترین رباعی یہ ہے:۔

تاکی عمرت بخود پرستی گزرد　　یا در غم نیستی و ہستی گزرد

آن عمر کہ مرگ باشد اندر پئے آن　　آں بہ کہ بخواب یا بمستی گزرد

عراقی　عراقی۔ فخر الدین ابراہیم ہمدانی کا نام تصوف کی شاعری میں اس دور کی آخری یادگار ہے۔ قرآن مجید کا ناظرہ اور حافظہ ختم کرنے کے بعد کوئی سترہ برس کی عمر ہوگی کہ قلندروں کے ایک گروہ سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ایک قلندر ایسا پسند آیا کہ اُس کے ہمراہ ہندوستان آئے اور یہاں شیخ بہاء الدین زکریا کے مریدوں میں شامل ہوئے۔ حسب دستور چلّہ کشی کے لئے بیٹھے لیکن دسویں ہی دن مریدوں نے شیخ سے شکایت کی کہ نیا مرید بجائے اذکار و اوراد کے اپنی ایک غزل گایا کرتا ہے جو تمام اوباشوں میں مشہور ہوگئی ہے۔ شیخ نے بلوا کے وہ غزل سُنی۔ بعض اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند　　ز چشم مستِ ساقی وام کردند

لبِ میگونِ جاناں جام در داد　　شرابِ عاشقانش نام کردند

سر زلفِ بتاں آرام نگرفت　　ز بس دلہا کہ بے آرام کردند

بہ مجلس نیک و بد را جائے دادند　　بجامی کارِ خاص و عام کردند

نہاں با محرمے رازے بگفتند　　جہانے را ازاں اعلام کردند

بعالم ہر کجا درد و غمے بود　　بہم کردند و عشقش نام کردند

نظم کر ڈالی ہے اگر ملتی تو یقیناً عجب کیفیت کی ہوتی۔ ایک شعر اور سنو:۔

عراقی طالب درد است و آن نیز — بامیدے کہ درمانش تو باشی

سعدی و عراقی کے کلام پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کی یادگار کمال کو آراستہ کرنے کے لئے ساز و سامان مہیا ہو رہے ہیں۔ نہ ایسے کامل شعرا گذرتے نہ حافظ کی طبیعت میں زور آتا۔

اوحد الدین کرمانی

اسی سلسلے میں اوحد الدین کرمانی کا ذکر مناسب ہے۔ ان کی ایک مثنوی مصباح الارواح اور ایک دیوان بھی سات ہزار شعر کا ہے شیخ محی الدین ابن عربی شمس تبریز اور مولانا روم کے فیض صحبت سے مستفیض ہوئے تھے۔ مثنوی میں حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ انھیں کے ایک ہمنام اصفہان یا مراغہ میں پیدا ہوئے تھے جو ان کے مرید بھی تھے۔ ان کی مثنوی جامِ جم مشہور ہے اور سلطان ابو سعید کے نام پر معنون ہے۔ اس مثنوی کا رنگ حدیقہ سنائی سے ملتا ہے۔ دیوان بھی چھ سات ہزار شعر کا ہے جس میں علاوہ وعظیات کے غزلیں بھی ہیں۔ ایک غزل درج کی جاتی ہے تاکہ رنگ طبیعت کا اندازہ ہو جائے:۔

اوحد الدین صفہانی

پیداست حالِ مردم رنداں چناں کہ ہست

خرم کسیکہ فاش کند ہر نہاں کہ ہست

ای محتسب تو دانی شرع و اساس آن

آئینِ عشق را بگذار آنچناں کہ ہست

مومن ز دین برآمد و صوفی ز اعتقاد

ترسا محمدی شد و عاشق ہماں کہ ہست

خلقے نشان دوست طلب می کنند و باز

از دوست غافلند بچندیں نشان کہ ہست

باب نہم

تیموریہ

تمہید

ابو سعید ایلخانیوں کا آخری فرمانروا ۱۳ ربیع الثانی ۷۳۶ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۳۳۵ء کو بگرائے ملک عدم ہوا اور اسی سال ۲۵ شعبان سنہ مطابق ۸ اپریل ۱۳۳۶ء کو حسب روایت مطلع السعدین تیمور لنگ کی ولادت ہوئی۔ ابو سعید کی وفات سے لیکے فترت تیموریہ تک جتنا زمانہ گذرا اُس میں ایران چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم ہو گیا تھا جن میں سے ممتاز سلطنتیں چار تھیں (۱) آل مظفر جن کی حکومت فارس اور عراق عجم اور کرمان پر تھی۔ (۲) جلائر (ایلخانی) جو بغداد اور آذربائیجان میں سلطنت کر رہے تھے۔ (۳) سربدار (یا سربدال) جو سبزوار کے بادشاہ تھے۔ اور (۴) کُرت جن کا مستقر آیالت ہرات تھا۔ یہ چند سلطنتیں اگرچہ مختصر تھیں مگر تربیت اہل فضل و کمال کے معاملے میں ہر ایک سبقت لے جانے کے لئے کوشاں تھی۔ لہذا پہلے انھیں کے مختصر حالات لکھے جاتے ہیں۔

آل مظفر

(۱) آل مظفر (۱۳۱۳ء تا ۱۳۹۳ء) کی سلطنت کا آغاز مبارز الدین محمد سے ہے جسے سلطان الجائیتو خان نے یزد کی حکومت عطا کی تھی۔ اس کے بزرگ بھی ہلاکو خاں کے ساتھ رہے تھے اور اپنے کو عرب کہتے تھے جو ابتدائے فتوحات اسلامیہ میں آکے آباد ہوئے تھے۔ ۷۱۳ھ مطابق ۱۳۱۳ء سے مبارز الدین کی حکومت کا آغاز ہوا۔ اس کے پانچ بیٹے تھے۔ شرف الدین مظفر۔ شاہ شجاع۔ قطب الدین محمود۔ احمد۔ بایزید۔ مبارز الدین کے عہد میں فتوحات بھی ہوئے۔ کرمان کو قطب الدین سے لیا اور فارس کو مع شیراز و اصفہان ابو اسحٰق انجو کو شکست دیکے حاصل کیا۔ پھر تبریز پر

تیمور کا دوسرا حملہ ہوا جس میں شاہ منصور کو شکست دیکے زین العابدین کو پھر بادشاہ بنایا۔ آخر تمام آل مظفر نے تیمور کی اطاعت قبول کی گرفتہ رفتہ سب قتل ہو گئے اور ۱۰۔ رجب سنہ ۷۹۵ھ مطابق ۲۲ مئی سنہ ۱۳۹۳ء میں بجز شبلی اور زین العابدین کے کوئی نہ بچا۔ پھر تیمور ان دونوں کو بھی سمرقند لے گیا جہاں اپنی زندگی کے دن پورے کرکے مرگئے اور آل مظفر کا اس عبرتناک طریقے سے خاتمہ ہو گیا۔

(۲) جلائر۔ امیر چوپان اور حسن جلائر کا ذکر ابو سعید کے حال میں آچکا ہے جسکے انتقال کے بعد حسن جلائر نے اُس کی بیوہ دلشاد خاتون سے عقد کر لیا اور سات برس امیر چوپان کی اولاد اور حسن جلائر سے لڑائیاں رہیں۔ انقلاب زمانہ نے امیر چوبان کے خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ ان میں سے حسن کوچک زیادہ مشہور ہے اور حسن جلائر کو تاریخ میں حسنِ بزرگ کہتے ہیں۔ یہ دونوں کسی نہ کسی شخص کو ہلاکو کے خاندان میں بادشاہ بنا کے آپس میں لڑا کرتے تھے۔ آخر حسن بزرگ کا سنہ ۷۴۰ھ مطابق سنہ ۱۳۳۹ء میں بغداد و تبریز پر قبضہ ہو گیا اور خود جلائر خاندان کا پہلا بادشاہ قرار پایا۔ ۲۷۔ رجب سنہ ۷۴۴ھ مطابق ۱۵۔ دسمبر سنہ ۱۳۴۳ء کو حسن کوچک کو اُسکی زوجہ نے مار ڈالا تو اور بھی اطمینان ہو گیا۔ بیس برس سلطنت کرکے حسن جلائر نے قضا کی اور اُس کا بیٹا سلطان اویس جو دلشاد خاتون کے بطن سے تھا وارث سلطنت ہوا۔ بیس برس اس نے بھی حکومت کی اور اہل فضل و کمال کی تربیت میں منہمک رہا۔ سلمان ساوجی اسی کی تعریفوں کا مداح ہے۔ ۲۔ جمادی الاول سنہ ۷۷۶ھ مطابق ۹۔ اکتوبر سنہ ۱۳۷۴ء کو اسکا بھی انتقال ہوا اور خاندان جلائر[۵۱] پر زوال آنے لگا جس دن اُس کا انتقال ہوا اُسی دن اسکے بڑے بیٹے کو امراے دربار نے قتل کرکے چھوٹے بیٹے حسین جلائر کو تخت نشین کیا

---

۵۱ اس خاندان کو کبھی ایلخانی بھی کہتے ہیں کیونکہ حسن جلائر بن آق بوغا بن ایدکاق اپنے کو ہلاکو کی اولاد میں گنتا تھا۔

رہتا تھا اور تربیت علم و فضل ہوا کرتی تھی۔ پھر اسکا بھائی ملک غیاث الدین وارث ہوا۔ ۷۱۸ھ میں نکوداریوں سے مقابلہ ہوا اور ۷۲۰ھ میں فتح پائی اور نکوداریوں کا بالکل استیصال ہوگیا۔ ۷۲۹ھ مطابق ۱۳۲۹ء میں اسکا انتقال ہوا اور ملک شمس الدین تخت نشین ہوا مگر دو ماہ کے بعد مرگیا اور اُس کا بھائی ملک حافظ بادشاہ ہوا۔ دو برس بعد وہ بھی مرگیا اور ملک معزالدین تخت نشین ہوا یہ وہی زمانہ تھا جب سلطان ابوسعید کا انتقال ہوا اور تیمور لنگ کی ولادت ہوئی۔ اس کی سلطنت چالیس برس رہی اور سربداریوں کا بڑھتا ہوا خاندان اسی کے ہاتھوں ختم ہوا۔ یہ بڑا بے رحم بادشاہ تھا اور دشمنوں کے کٹے ہوئے سروں کے دو مینار نصب کرائے تھے ۷۷۱ھ مطابق ۱۳۶۹ء میں اس نے وفات پائی اور اس کا بیٹا غیاث الدین پیر علی بادشاہ ہوا۔ اب تیمور لنگ کو اس ملک کی طرف توجہ ہوئی۔ پہلے اپنی بھتیجی سونج قتلق آغا کو پیر علی کے بیٹے پیر محمد کے عقد میں دیا۔ پھر سلطنت پر حملہ کرکے اپنے بیٹے میران شاہ کو حاکم کردیا اور پیر علی اور پیر محمد کو گرفتار کرکے سمرقند لے گیا اور ۷۹۱ھ مطابق ۱۳۸۹ء میں سارا خاندان کرت ختم کردیا۔

سربدار (۴) سربدار۔ یہ خاندان پچاس برس تک امن و امان سے سبزوار میں حکمراں رہا۔ اس عرصے میں بارہ بادشاہ ہوئے آخری بادشاہ خواجہ علی موئید نے اپنی حکومت بڑھائی تھی مگر معزالدین کرت کے ہاتھوں ۷۸۳ھ مطابق ۱۳۸۱ء میں ساری امنگوں کا خاتمہ ہوگیا۔ ابن یمین اسی دربار سے توسل رکھتا تھا۔

امیر تیمور امیر تیمور گورگان صاحبقران بعض کے نزدیک قوم کا گڈریا تھا اور بعض مورخ چنگیز خاں کی اولاد سے بتاتے ہیں۔ اسکے حالات فارسی میں ظفر نامۂ شرف الدین علی یزدی اور ظفر نامۂ نظام شامی سے

بیٹے عمر شیخ مرزا کا انتقال ہو چکا تھا لہذا پیر محمد جہانگیر اپنے پوتے کو اس عظیم سلطنت پر حکمرانی کے لئے نامزد کر گیا۔

شاہرخ

تیمور کے بعد میران شاہ تیسرا بیٹا دو تین سال زندہ رہا مگر مخبوط الحواس۔ البتہ شاہرخ چوتھا بیٹا خراسان پر اطمینان سے حکومت کرنے لگا جب وصیت پیر محمد کو سلطنت ملی مگر میران شاہ کے بیٹے خلیل سلطان نے حملہ کر کے شکست دیدی اور سمرقند میں تخت نشین ہوا۔ یہ اپنی معشوق شاد ملک کا اتنا گرویدہ تھا کہ امرائے دربار ناراض ہو گئے اور اُسے معزول کر کے جلاوطن کر دیا۔ اب شاہرخ نے اس طرف کا قصد کیا اور وارث سلطنت تیموری ہوا۔ اسکے حکومت کا زمانہ نہایت امن و آسائش کا تھا۔ رفتہ رفتہ کل مفتوحات پر قبضہ کر کے باپ کے تاراج کئے ہوئے شہروں کو آباد کیا اور صنائع و فنون کی تربیت میں مصروف ہو گیا سلاطین وقت سے کبھی دوستانہ مراسم پیدا کئے اور خیرات و مبرات میں وہ نام پیدا کیا کہ حاتم وقت کہلانے لگا۔ آخر ۸۵۰ھ مطابق ۱۴۴۶ء میں ۴۳ برس سلطنت کر کے وفات پائی۔

الغ بیگ

اسکے بعد الغ بیگ اسکا بیٹا تخت نشین ہوا۔ اس نے سمرقند کی مشہور رصدگاہ تعمیر کی اور خود زیج الغ بیگی مرتب کی جو علم ہندسہ و ہیئت کی بہترین خدمت کہلانے کے قابل ہے۔ اسکا بیٹا عبداللطیف مخالف ہو گیا اور ایک شخص عباس نام کے ہاتھوں قتل کرا دیا (عباس کشت۔ تاریخ وفات ہے) مگر خود بھی عرصے تک زندہ نہ رہ سکا اور ایک شخص باباحسین نے اسکا خاتمہ کر دیا (باباحسین کشت اسکی تاریخ وفات ہے)۔

زوال تیموریہ

اب آل تیمور پر زوال آگیا سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ۸۵۵ھ ہر تیموری اپنے کو وارث تخت سمجھتا تھا۔ اُدھر ترکمانوں کا زور بڑھا۔ پہلے قرا قیونلو (قرا یوسف) کا خاندان غالب آنے لگا پھر ان لوگوں پر زوال آیا اور آق قیونلو ترکمان غالب ہوئے۔ آخر اسمٰعیل شاہ صفوی نے انکا خاتمہ کر کے ۹۰۶ھ مطابق ۱۵۰۱ء عرش نشین ہوا اور رفتہ رفتہ تمام ایران

سنہ ۸۰۴ھ میں امیر تیمور نے اُسے تاریخ لکھنے کا حکم دیا اور کاغذات متعلقہ حوالے کئے۔ سنہ ۸۰۶ھ میں جب تیمور ملک گیری کے لئے چلا تو اُسے اپنے پوتے عمر بہادر بن میران شاہ کے یہاں بھجوا دیا جہاں یہ تاریخ ختم ہوئی۔

شرف الدین علی یزدی

شرف الدین علی یزدی کا ظفر نامہ اسکے بعد تصنیف ہوا ہے۔ عبارت مغلق اور مسجع ہے اور بیشتر واقعات ظفر نامۂ نظام شامی سے لئے ہیں یہانتک کہ قرآن مجید کے اقتباسات اور اشعار بھی اُسی کتاب کے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہی ظفر نامہ مرصع کیا گیا ہے لیکن اس ظفر نامہ کی اشاعت نے اُسکا چراغ گل کردیا۔ سنہ ۸۲۸ھ میں ظفر نامہ تصنیف ہوا۔ صنف فی شیراز تاریخ اختتام ہے اسکے علاوہ ایک کتاب معمّا اور چیستان پر لکھی اور ایک شرح قصیدۂ بُردہ کی تصنیف کی۔ کحل المراد در علم وفق اعداد میں طلسمات اور تعویذات درج کئے ہیں۔ ایک دیوان اور ایک مثنوی نظم میں اسکی یادگار ہے مصنّف کی بیشتر زندگی شاہرخ اور اُسکے بیٹے مرزا ابراہیم سلطان کے یہاں گذری پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گیا یہانتک کہ سلطان محمد والی عراق نے اُسے قم میں بلا لیا۔ جب شاہرخ نے اُس پر بجرم بغاوت حملہ کیا اور فتح پائی تو مشیران کار کو قتل کیا شرف یزدی بھی اُنھیں میں تھا مگر مرزا عبد اللطیف نے سفارش کی کہ اسے میرے باپ الغ بیگ کے پاس بھیجدیجئے۔ رصد خانہ میں ضرورت ہے۔ بادشاہ نے جان بخشی کی اور سمرقند بھیجدیا۔ وہاں سے آخر عمر میں وطن واپس ہوا اور سنہ ۸۵۸ھ میں وہیں انتقال کیا۔

حافظ آبرو

حافظ آبرو (نور الدین لطف اللہ ہروی) نے زبدۃ التواریخ لکھی اور بایسنغر پسر شاہرخ کو نذر کی۔ مجمل فصیحی میں اس کتاب کا نام مجمع التواریخ سلطانی لکھا ہے سنہ ۸۲۳ھ میں علاوہ تاریخ کے ایک جغرافیہ بھی تصنیف کرکے شاہرخ کے نام پر معنون کیا تھا۔ مصنّف تیمور کے ہمراہ بعض فتوحات میں موجود تھا اور شاہرخ کے

کی بنوائی ہوئی خانقاہ کا شیخ ہو گیا۔ ۸۸۰ھ مطابق ۱۴۸۲ء میں انتقال کیا۔ مطلع السعدین اسی کی تصنیف ہے جس میں ابو سعید[1] ایلخانی کے حال سے ابو سعید تیموری تک کے حالات درج ہیں۔ معین الدین محمد[2] اسفزاری نے روضۃ الجنات فی تاریخ مدینۃ ہرات میں ۸۷۵ھ تک کے واقعات لکھے (شہر صفر تاریخ اختتام ہے۔ اسی مہینے میں یہ کتاب ختم بھی ہوئی تھی)۔ اور سلطان[2] حسین ابو الغازی کو نذر دی۔

معین الدین اسفزاری

یہ بادشاہ اور اسکا وزیر امیر علی شیر (المتوفی ۹۰۶ھ) دونوں تربیت فضل و کمال کے لئے تاریخ میں مشہور ہیں۔ محمد بن خاوند شاہ بن محمود المعروف بمیر خوند (المتوفی ۹۰۳ھ) نے روضۃ الصفا لکھی اور امیر علی شیر کو نذر دی۔ ابتدائے آفرینش سے ۸۷۳ھ تک کی تاریخ چھ جلدوں میں ہے۔ ساتویں جلد غالباً اسکے پوتے خوندمیر نے اضافہ کی اور ۹۱۲ھ تک پہونچا دیا۔ اسی جلد میں سلطان حسین ابو الغازی کے حالات بالتفصیل ہیں۔ عبارت پوری کتاب کی فصیح و بلیغ ہے اور کسی قدر پر تکلّف بھی۔ رضا قلی خاں ہدایت نے ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں ایک ضمیمہ بڑھایا جس میں اپنے وقت تک کے حالات درج کئے ہیں اور بابیوں کے واقعات اچھی طرح لکھے ہیں۔ خوندمیر (المتوفی ۹۴۱ھ مطابق ۱۵۳۴-۳۵ء) اسکے پوتے نے حبیب السیر لکھی۔ یہ ۹۲۹ھ کی تصنیف ہے اور اچھی تاریخ ہے۔

روضۃ الصفا

حبیب السیر

ان تاریخوں کے علاوہ تذکرے بھی نہایت عمدہ لکھے گئے۔ منجملہ اُن کے دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعرا ہے۔ ۸۹۲ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی اور حالات شعرا میں علاوہ قصص و حکایات کے کلام کے انتخابات بھی درج کئے گئے

تذکرۂ دولت شاہ

---

[1] چنگیز خانیوں کا آخری فرمانروا۔ [2] حسین بن منصور بن بیقرا بن عمر شیخ بن تیمور کی حکومت ابو سعید تیموری کے بعد ہرات میں قائم ہوگئی اور ۳۸ برس سلطنت کرکے ۹۱۱ھ میں انتقال کیا۔ ملا جامی۔ میر خوند اور مشہور بہزاد مصوّر اسی کے دربار سے متوسل تھے (سائکس "پرشیا")۔

خوان کو بلاؤ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجلسیں پڑھنے والے روضہ خوان کہلانے لگے۔

اخلاق محسنی اخلاق محسنی مؤلفہ ۹۰۰ھ مطابق ۱۴۹۴ء میں مختلف اخلاق فاضلہ کی توضیح کی ہے مگر عربیت کی کثرت سے ہر توضیح مغلق ہو گئی ہے۔ پھر ہر خلق کے متعلق حکایتیں درج کی ہیں۔ اگر گلستاں کا جواب سمجھا جائے تو دونوں میں ذرہ اور آفتاب کی بھی نسبت نہیں۔

انوار سہیلی یوں بہت اچھی ہے۔ انوار سہیلی میں کلیلہ و دمنہ کا قصہ نہایت شیریں اور دلکش انداز میں لکھا ہے اگرچہ زور قلم سے داستان کو بیحد طویل کر دیا ہے۔

لب لباب مثنوی مولانا روم کا خلاصہ بھی تیار کیا تھا جس کا نام لب لباب ہے۔

جواہر التفاسیر اور تفسیر میں جواہر التفاسیر لکھی تھی۔ محقق دوانی (جلال الدین محمد بن سعد الدین اسعد) ۸۳۰ھ میں پیدا ہوئے۔ پہلے اپنے والد ماجد کے شاگرد ہوئے پھر ملا محی الدین انصاری۔ خواجہ حسن شاہ اور سید شریف وغیرہ سے درسیات پڑھے یہانتک کہ علمائے زمانہ میں شمار ہونے لگا اور رفتہ رفتہ محقق کہلانے لگے تحصیل علم سے فراغت حاصل ہونیکے بعد گازرون کے قاضی ہوئے پھر مدرسہ دار الایتام کے صدر مقرر ہوئے سلاطین آق قونیلو نے انھیں قاضی القضاۃ کا عہدہ عطا کیا آخر ۹۰۸ھ میں انتقال کیا۔ نظم میں فانی تخلص تھا اور نثر میں عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ شرح ہیاکل۔

اخلاق جلالی شرح عقائد عضدی۔ نور الہدایہ وغیرہ مگر شہرت انکی اخلاق جلالی سے دنیائے ادب میں قائم ہوئی۔ یہ کتاب ۱۴۶۷ء اور ۱۴۷۷ء کے درمیان میں تصنیف ہوئی ہے عبارت کسی قدر دقیق ہے اور بعض جگہ طویل۔ عالمانہ و حکیمانہ رنگ کے آدمی ہیں اخلاق ناصری کے مباحث اپنے رنگ میں بیان کیے ہیں مگر اتنی پختگی نہیں جتنی محقق طوسی کے یہاں ہے لیکن کسی دوسرے کی مجال نہیں کہ ان سے اس رنگ میں ہمسری کا دعوی کر سکے۔

افسوس کہ نثر ہی کے بیان میں اتنا طول ہو گیا اور ابھی بہت لوگ

حقائق الاشیاء کما ھی۔ غشاوت غفلت از بصر بصیرت ما کشائے۔ وہر چیز را چنانکہ ہست بنمائے۔ نیستی را در صورت ہستی جلوہ مدہ۔ و از نیستی بر جمال ہستی پردہ منہ۔ این صور خیالی را آئینۂ تجلیات جمال خود گرداں نہ علت حجاب و دوری۔ و این نقوش وہمی را سرمایۂ دانائی و بینائی ما گرداں نہ آلت جہالت و کوری" الخ

مولانا جامی کے اور بھی تصانیف نادرہ ہیں یہاں تک کہ موسیقی پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے مگر ہم اب اختصار کو مدنظر رکھ کے تاریخ نظم شروع کرتے ہیں۔

ابن یمین

امیر فخر الحق والدین محمود بن یمین فریومدی المتوفی ۷۶۹ھ مطابق ۱۳۶۷ء ان کا باپ یمین الدولہ ترکی النسل تھے اور سلطان الجائتو کے زمانے میں آ کے فریومد میں مقیم ہوئے تھے۔ خواجہ علاء الدین وزیر سلطان ابو سعید کے مربی تھے ابن یمین اسی قریہ میں پیدا ہوئے۔ صاحب مجمع الفصحا وغیرہ نے انھیں سربداریوں کے مداحوں میں شمار کیا ہے اور امیر تغا تیمور کا بھی مداح سمجھا ہے۔ کہتے ہیں کہ سربداریوں کے ہنگامۂ زوال میں دیوان ضائع ہو گیا۔ اخلاقی شاعری میں قطعات بہت بلند پایہ کے ہیں۔ تمثیلات میں قوت تخییل بھی نہایت قوی ہے اور زبان سلیس اور شستہ۔ جاہ طلبی پر کیا خوب کہا ہے:۔

ز دیوانہ کرد روزے سوال	سلیمان مرسل علیہ السلام
کہ چوں بینی این سلطنت کز پدر	مرا ماند باایں ہمہ احتشام
چہ خوش گفت دیوانہ او را جواب	کہ چوں نیست این مملکت مستدام
پدر داشت ایں سرد کوفت بیکار کام کرنا	تو در باد پیمودنی صبح و شام بیکار کام کرنا

تخت سلیمان اور زرہ سازی داؤد پر نظر کرو تو محاورات میں لطف

خمسہ نظامی کا جواب بھی نظم کیا ہے۔ نوروز گل [۱] (۲۶۱۵ شعر) ہمائے و ہمایوں [۲] (۴۲۰۲ شعر) کمال نامہ [۳] - روضۃ الانوار [۴] - ایک اور مثنوی [۵] جس کا نام یاد نہیں آتا۔ علاوہ ان کے قطعے اور رباعیاں بھی کہی ہیں اور مستزاد بھی نظم کئے ہیں :-

کس نیست کہ گوید ز من آن ترک ختا را	گر رفت خطائے
باز آے کہ داریم توقع بتو ما را	با وعدہ وفائے
منداز بنام من دلسوختہ قلقل بینداز	بر آتش رخسار
کافتادم ازاں دانۂ مشکین تو یارا	در دام بلائے
امروز منم چوں خم ابروے تو در شہر	مانند ہلالے
تا دیدہ ام آں صورتِ انگشت نما را	انگشت نمائے
در شہر شما قاعدہ باشد کہ نپرسند	احوال غریباں
آخر چہ زیاں مملکت حسن شما را	از بے سر و پائے الخ

عبید زاکانی

عبید زاکانی [۱] نظام الدین عبید اللہ کی نشو و نما شیراز میں ابو اسحٰق انجو کے زمانے میں ہوئی اور علم و فضل میں امتیاز حاصل کیا یہاں تک کہ قزوین کا قاضی مقرر ہو گیا۔ اسکے زمانے میں تاتاریوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے ایرانیوں کی حالت خراب کر دی تھی اور اخلاق رذیلہ کی طرف شغف بڑھتا جاتا تھا۔ مجبوراً اس زمانے کی حالت دکھانے کے لئے اخلاق الاشراف تصنیف کی اور جہالت کا خاکہ رسالۂ دلگشا میں کھینچا۔ پھر اخلاق حسنہ کی تعلیم کے لئے رسالہ صد پند اور رسالۂ تعریفات تصنیف کئے جن سے اس کا کمالِ علمی بخوبی ثابت ہوتا ہے خستہ حالی اور ناداری کے غلبے نے درباری شعرا میں داخل ہونے کا شوق پیدا کیا اور ایک رسالہ معانی و بیان میں تیار کر کے

---

[۱] زاکان اضافات قزوین کا ایک قریہ ہے۔ سال وفات ۷۷۲ھ مطابق ۱۳۷۰ء

سلمان بھڑک گیا اور پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو؟ جواب دیا "قزوین سے"۔ پوچھا ہمارے اشعار بھی وہاں مشہور ہیں یا نہیں" کہا "ہاں! یہ اشعار مشہور ہیں:۔

من خراباتیم و بادہ پرست — در خرابات مغان عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش — می برندم چو قدح دست بدست

مردمان مرا می کشند — مرا می برند

میرے نزدیک بھی سلمان ایک کامل شاعر ہے مگر یہ اشعار اُسکی بیوی کے معلوم ہوتے ہیں" سلمان جھینپا اور سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو عبید یہی ہے اور اپنی ہجو کی بہت معذرت کی۔ اب یہ بغداد میں رہنے لگا اور سلمان اسکی خاطر کرنے لگا عبید کہا کرتا تھا کہ "سلمان تم بڑے خوش قسمت ہو کہ میری زبان کے زہر سے ہلاک نہ ہوئے"

عبید کے تصانیف میں عشاق نامہ بھی قابل ذکر ہے۔ اسکے علاوہ قصائد و قطعات ہیں جو سنجیدگی کے عالم میں نظم ہوگئے اور غزلیات سے کوسوں دور رہے مثلاً:۔

افتاد بازم در سر ہوائے — دل باز دارد میلے بجائے
او شہریارے من خاکسارے — او بادشاہے من بینوائے
بالا بلندے گیسو کمندے — سلطان حسنے فرماں روائے
ابرو کمانے نازک میانے — نامہربانے تنگے دغائے
دارد شکایت ہر کس ز دشمن — مارا شکایت از آشنائے

دیکھو کتنی شیریں زبان ہے اور کیسی دلکش طرز ادا۔ افسوس! متاخرین نے اس رنگ کی قدر نہ کی۔ ایک مثنوی اسکی اور دلچسپ ہے جسے فارسی کا چوہے نامہ کہنا چاہیے۔ اس کا نام موش و گربہ ہے۔ بلی کی تعریف ہے:۔

از قضائے فلک یکے گربہ — بود چوں اژدہا بکرمانا

رنگ خاص تھا۔ ہر نظم میں کھانے کا ذکر ہوتا تھا۔ استعارہ۔ تشبیہ۔ صنائع۔ غرض ہر قسم کی تخییل۔ اسی التزام کے ساتھ ہوتی تھی مثلاً اسکے پیر شاہ نعمت اللہ نے یہ رباعی کہی :-

گوہر بحر بیکراں مائیم — گاہ موجیم و گاہ دریائیم
ما بدیں آمدیم در دنیا — کہ خدا را بخلق بنمائیم

اس نے فوراً یوں الٹ دی :-

رشتۂ لاک معرفت مائیم — گہ خمیریم و گاہ بغرائیم
(موئے خمیر)
ما ازاں آمدیم در مطبخ — کہ بما ہیچ قلیہ بنمائیم

نعمت اللہ سے جو ملاقات ہوئی تو کہا کہ میں نے خدا کا ذکر کیا تھا تو نے یہ کیا کیا؟ جواب دیا کہ "اللہ تک تو رسائی نہ تھی میں نے نعمت اللہ (خدا کی نعمت) کا ذکر کیا۔" اپنی شاعری پر فخر کرتا ہے :-

خوانے کشیدہ ام ز سخن قاف تا بقاف — ہم کاسۂ کجاست کہ آید برابرم

کلیات کا نام دیوان اطعمہ نام ہے۔ رباعی۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ سب کچھ کہا ہے اور اسی رنگ میں کہا ہے۔

محمود قاری

نظام الدین محمود قاری یزدی نے دیوان البسہ جمع کیا۔ یہ لباسوں کا ذکر کرتا ہے۔ کبھی کبھی مقامی محاورات میں اشعار بھی کہے ہیں اور یہی اسکے فہلویات و شیرازیات ہیں۔

شاہ نعمت اللہ

شاہ نعمت اللہ کرمانی کا کلام تصوف میں یادگار ہے۔ اُنکے والد کا نام میر عبداللہ ہے اور نسب امام محمد باقر علیہ السلام تک پہونچتا ہے۔ سنہ ۷۳۰ھ مطابق سنہ ۱۳۲۹-۳۰ء میں بمقام حلب آپکی ولادت ہوئی۔ ۲۴ برس کے تھے کہ حج بیت اللہ کیا اور مکہ معظمہ میں سات برس مقیم رہے۔ پھر سمرقند۔ ہرات اور یزد میں زندگی کے دن کاٹے آخر عمر میں کرمانشاہ واپس آئے اور وہیں ۲۲ رجب سنہ ۸۳۴ھ مطابق ۵ اپریل سنہ ۱۴۳۱ء میں

اس غزل کے بعض اشعار سے ہوجائیگا:۔

ستہ ایام گفت و سبع سماوات — ثم علی العرش استواست نہایات

حضرتِ حق را عروش نامتناہی است — فاش بگویم عروش جملۂ ذرّات

بر ہر ہر ذرہ مستوی است باسمے — چوں بشناسی رسی بہ نیل مرادات

نعرۂ مستی مزن کہ مست ہوائی — غایت عمیا بود بجہل مباہات

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ یہ غزل فرقۂ حروفیہ[۱] کے رنگ میں کہی ہے اور مولانا جامی نے انھیں اس انتساب میں کسی قدر ماخوذ کیا ہے۔ واللعلم عنداللہ۔ مثنوی انیس العارفین بھی تصوف میں ہے جسکے بعض اشعار شیخ صفی الدین اردبیلی کی تعریف میں ہیں:۔

شیخ عالم آفتاب اولیا — پیشوائے دیں صفی الاصفیا

آنکہ از وے گشت مشہور اردویل (اردبیل) — وز جمالش گشت پُر نور اردویل

---

[۱] فرقہ حروفیہ کی ابتدا فضل اللہ استرابادی کی ذات سے امیر تیمور کے زمانے میں ۸۰۰ھ میں ہوئی۔ یہ لوگ حروف تہجی کو مظاہر حالات انسانی سمجھتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ حلال و حرام کے منکر تھے۔ ابتدا میں کوشش یہی کہ یہ مذہب خاندان تیموریہ میں پھیل جائے مگر احمد لُر کی وجہ سے یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ اسکی جیب سے بوقت قتل ایک کنجی برآمد ہوئی جس سے ایک مکان کھولا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ حروفیوں کی خفیہ خانقاہ ہے اور اس سوسائٹی کے ممبروں کے نام بھی معلوم ہو گئے جو رفتہ رفتہ قتل کر ڈالے گئے۔ ۷۹۶ھ میں میرانشاہ نے فضل اللہ کو قتل کر کے لاش کو تشہیر کرایا۔ اس واقعے سے حروفیوں میں جوش پیدا ہوا اور اپنا مذہب پھیلانے نکل پڑے چنانچہ ایک خلیفہ علی الاعلیٰ بلاد روم میں پہونچا اور وہاں بکتاشیوں میں مل کے اپنے اعتقاد پھیلائے جسکے آثار آج تک ملتے ہیں۔ جاوداں نامۂ کبیر فضل اللہ کی کتاب اور اسکے خلفا کے پانچ جاویدان اس مذہب کے اصل لٹریچر ہیں۔ انکے علاوہ آدم نامہ، عرش نامہ، ہدایت نامہ، استوا نامہ، کرسی نامہ، محبت نامہ وغیرہ فارسی میں ہیں اور فیض نامہ، گنج نامہ وغیرہ ترکی میں ہیں۔ انکے جاویدان میں بعض مقامات مبہم ہیں اور رموز میں بیان کئے گئے ہیں جسکا حل انکی ایک کتاب مفتاح الحیات میں ہے۔ ترکی شعرا میں اس فرقے کے لوگ نامور ہوئے ہیں۔ ایران میں یہ مذہب نہ پھیل سکا۔

کہ خواجہ حافظ فرماتے ہیں :۔

سرآمد فضلائے زمانہ دانی کیست　　　ز راہ صدق و یقین نی ز راہ کذب و گماں

شہنشہِ فضلا پادشاہِ ملکِ سخن　　　جمالِ ملت و دیں خواجہ جہاں سلمان

فی الحقیقت خواجہ سلمان کی شاعری کی داغ بیل کمال اسمٰعیل اور ظہیر فاریابی کی طرحوں پر پڑی اور اکثر انھیں کے جواب میں قصائد نظم کئے لیکن ذوق سلیم اور مناسبت خداداد نے اس کا پایہ کافی بلند کر دیا۔ زبان میں شیرینی۔ ترکیبوں میں چستی۔ دقیق اور نازک مضمون آفرینی سے کلام مالا مال ہے۔ جدّت پسند اور شوخ طبیعت معمولی تشبیہوں اور استعاروں میں بھی مزہ بھر دیتی ہے :۔

چشمت بخنجرِ مژہ عالم خراب کرد　　　کس خنجر کشیدہ بمستے چناں دہد؟

مژہ کو خنجر کہنا یا آنکھوں کو مست کہدینا ہر شاعر کے لئے ممکن ہے مگر دوسرے مصرعے میں جو سوالیہ صورت اختیار کی ہے دیکھو کتنے مزے کی ہے۔ ایک سادہ شعر اسی قصیدے کا سنو :۔

در رستۂ جمالِ تو ہر کس کہ عاشق است　　　جانے بیک نظر دہد و بس گراں دہد

تخلیص کا مقام قصیدے میں قوت شاعری کی امتحان گاہ ہے۔ سلمان کی شوخ طبیعت عجب نزاکتیں پیدا کر دیتی ہے۔ معشوق کے دہن کی تعریف میں مبالغہ کیا جاتا ہے کہ معدوم ہے اور فتنہ پرداز بھی۔ ان دونوں مبالغوں کو یکجا کر کے مدح کی طرف گریز کرتا ہے :۔

نیست پیدا دہنت بررخ و در دولت شاہ　　　فتنہ آں بہ ہمہ وجہ کہ پنہاں باشد

مشکل ردیفیں اور قافئے اس کی زور طبیعت کے سامنے پانی ہیں :۔

صنم امروز بلائے شب ہجراں برسر　　　کردہ در کار تو چوں شمع دل وجاں برسر

سرو بہ پائے تو می میرد و مرغانِ چمن　　　میکنندش ہمہ شب نالہ و افغاں برسر

ذوق سلیم دور از کار مبالغوں سے مانع ہے :-

از بندہ مہتر ست بسی سال راستی ۔۔۔ گستاخی است برز بر مہتران نشست
بڑا

اپنے سے بڑوں پر سوار ہونا بے حد معیوب ہے اور یہی وجہ انکار۔

غزلیں کہی ہیں اور خوب کہی ہیں مگر سوز و گداز نہیں۔ چند سادہ شعر لکھے جاتے ہیں جن پر قصیدہ گوئی کا رنگ نہیں چڑھا ہے۔ ان میں کسی قدر تغزل ہے :-

ایکہ در خواب غروری خبرے نیست کہ من ۔۔۔ ہر شب از خاکِ درت بالش و بستر دارم

چشم فتاں تو ہر جا کہ بلا انگیز د ۔۔۔ ای بسا کس کہ دراں عرصہ بلاش اندازد
ایہام

مثنویوں میں کوئی خاص بات نہیں جو ذکر کیجائے۔ ایک قادر الکلام قصیدہ گو کی نظمیں ہیں اور بس۔

حافظ

حافظ شیراز۔[1] خواجہ شمس الدین محمد بن بہاء الدین محمد شیرازی۔ باپ تجارت پیشہ تھے۔ حافظ اور انکے دو بھائیوں کو چھوٹا چھوڑ کے انتقال کر گئے بدسلیقگی کی وجہ سے بھائیوں نے دولت اڑا دی اور وطن آوارہ ہو گئے حافظ شیراز ہیں رہے اور ماں نے پرورش کی۔ گھر میں فاقے ہونے لگے تو خمیر گری اختیار کی۔ اسی افلاس کے عالم میں پڑھنے کا شوق ہوا اور قرآن مجید حفظ کر کے کچھ درسیات بھی ختم کر لیے۔ محلے میں ایک بزاز رہتا تھا۔ وہاں شاعری کا چرچا تھا۔ حافظ کو یہ صحبت پسند آئی اور خود بھی نظم کرنے لگے مگر بے تکے اشعار جن کی وجہ سے خوب بنائے جاتے تھے۔ ایک دن اتنا بنائے گئے کہ دل ٹوٹ گیا۔ بابا کوہی کے مزار پہ رات بھر رویا کئے کہ یا تو شعر کہنا آجائے یا موت آجائے۔ آخر آنکھ لگ گئی۔ خواب میں امیر المومنین

---

[1] شعر العجم جلد دوم میں نہایت عمدہ تحقیقی حال اور تنقیدی تذکرہ دیا ہوا ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا جاتا ہے بیشتر اسی کا اقتباس ہے۔

چبھتا ہوا تھا:-

ای کبکِ خوش خرام کہ خوش میروی بناز — غرّہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

صفت و موصوف کی صورت میں محض عبید زاکانی کے گربہ و موش کا حوالہ ہے جہاں اُس نے کہا ہے:-

مژدگانی کہ گربہ عابد شد — زاہد و مومن و مسلمانا

مگر مضاف و مضاف الیہ کی حیثیت سے فقیہ صاحب پر لگتی ہوئی تھی۔ شاہ شجاع ناراض ہو گیا اور ہمیشہ اسی تاک میں رہا کہ خواجہ کو کسی طرح شکنجے میں لائے مگر اُسکا (۷۸۶ھ) میں انتقال ہو گیا اور منصور بادشاہ ہوا۔ خواجہ صاحب نے مبارکباد دی:-

بیا کہ رایتِ منصور بادشاہ رسید — نوید فتح و ظفر تا بمہر و ماہ رسید

جب منصور تیمور کے ہاتھوں مارا گیا تو بغداد سے سلطان احمد بن اویس نے بلا بھیجا اور جانے کو جی بھی چاہتا تھا مگر وطن کی خاک دامنگیر نے نہ چھوڑا۔ غزل کہہ کے بھیجدی جس کا مطلع یہ ہے:-

احمدُ اللّٰہ علیٰ معدلۃِ السلطانِ — احمدِ شیخ اویسِ حسنِ ایلخانی
از گلِ فارسی ام غنچۂ عیشے نشگفت — حبذا دجلۂ بغداد و مئے روحانی

پھر دکن سے محمود شاہ بہمنی نے طلب کیا اور زادِ راہ بھی بھیجا۔ خواجہ صاحب نے بھی تہیۂ سفر کیا مگر راہ میں لُٹ گئے۔ آخر دو تاجروں نے اُنکی کفالت کی اور ساحل تک لاکے جہاز میں بٹھا دیا۔ اتفاقاً جہاز چلنے نہ پایا تھا کہ طوفان آگیا۔ خواجہ صاحب ڈر کے اُتر آئے اور یہ غزل کہہ کے بھیجدی:-

دمے با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد — بمی بفروش دلقِ ما کزیں بہتر نمی ارزد
بس آساں می نمود اوّل غمِ دریا بہ بوئے سود — غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد

علاوہ بریں دیوان میں بعض اولاد کے مرنے پر مرثیے بھی موجود ہیں۔ حافظ کی علمی حالت بھی نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ فارسی غزلوں میں بے تکلّف عربی مصرعے نظم کئے ہیں اور معقول و منقول جاننے کا ادّعا بھی کیا ہے:۔

ز حافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد   لطائفِ حکما با کتابِ قرآنی

یہ بھی غلط ہے کہ امرا و رؤسا کے درباروں سے علیحدہ تھے۔ دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین وقت کی مدح سرائی کی ہے اور انعامات بھی حاصل کئے ہیں۔ ہاں گداگری نہیں کرتے تھے۔ اگر کچھ مل گیا تو شکر ورنہ صبر:۔

شاہ ہرمزم ندید و بے سخن صد لطف کرد   شاہ یزدم دید و مدحش گفتم و ہیچم نداد

کارِ شاہاں اینچنیں باشد تو اے حافظ مرنج   داور روزی رساں توفیق و نصرت شاں دہاد

انکی شاعری کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب فن شعر کی طرف انھیں توجہ ہوئی تھی تو اُس زمانے میں سعدی، خواجو اور سلمان کے کلام کا چرچا تھا۔ پہلے خواجو کا کلام پیش نظر رکھا اور شعر کہنا شروع کیا:۔

اُستاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس امّا   دارد غزل حافظ طرزِ سخنِ خواجو

خسرو اور سعدی کا سوز و گداز دنیائے شعر کو تسخیر کر چکا تھا مگر خواجو اور سلمان نے جدید ترکیبیں اور شوخ استعارات و تشبیہات کی قوت سے غزل میں بھی نام پیدا کر لیا۔ پھر زمانہ بھی موافق تھا۔ خواجو شیراز کا ملک الشعرا تھا اور سلمان بغداد کا۔ غریب خمیر گر کا کہیں ٹھکانا نہ تھا۔ انھیں اُستادوں کے کلام سُنے اور کچھ اخذ کیا مثلاً خواجو کے کلام میں بے ثباتی دنیا کا ذکر ہے یا رندی و مستی کا جوش اور سلمان کے یہاں بدیع الاسلوبی ہے اور ضلع جگت بھی۔ حافظ کے کلام کی داغ بیل انھیں پر پڑی ہے اور رفتہ رفتہ طبیعت خداداد نے وہ عمارت بنادی ہے جہاں غزل کو خود معراج نصیب ہوتی ہے۔ خواجو کہتے ہیں:۔

سودائے زہد خشکم برباد دادہ حاصل　　مطرب بزن ترانہ ساقی بیار بادہ

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سطح غزلیں بظاہر ابتدائی مشق کی ہیں ورنہ جب سے خداداد مقبولیت کا دور شروع ہوا رنگ ہی اور ہو گیا بلکہ جو خصوصیات انکی غزلوں میں پیدا ہو گئے اُن کا اجتماع کسی ذات میں ابھی آجتک ممکن نہ ہوا مثلاً شیرینی کلام اور فصاحت خداداد ہیں روزمرہ اور محاورات کی چشک دیکے شعروں کو دلکش بنا دیا ہے اور انکے اشعار میں جوش اس قدر ہوتا ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحب معاملہ ہیں اور اپنی بیتی سنا رہے ہیں۔ مثلاً معشوق کی یاد میں ایک وجد کی حالت طاری ہوتی ہے اور کہتے ہیں :-

در نماز خم ابروے تو ام یاد آمد　　حالتے رفت کہ محراب بفریاد آمد

یا مثلاً نشہ کی ترنگ یاد آتی ہے اور شوق پیدا ہوتا ہے کہ مرتے دم تک یہی حالت رہے۔ کہتے ہیں :-

زان پیشتر کہ عالم فانی شود خراب　　مارا بجام بادۂ گلگوں خراب کن

غریبوں کے ستانے کا انجام دکھاتے ہیں :-

بس تجربہ کردیم درین دیر مکافات　　با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

یوں تو خواجہ صاحب ہر رنگ میں پُرجوش ہیں لیکن شراب و ساقی کے چھیڑا چوٹ کھا گیا معاملات میں خدا جانے کتنا بلند ہو جاتے ہیں :-

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشکافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم
چو در دست است رودے خوش بزن مطرب سرود خوش
کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم

شاہد آں نیست کہ دارد خطِ سبز و لبِ لعل   شاہد آں است کہ ایں دارد و آنے دارد

حافظ کا شعر ہے :-

شاہد آں نیست کہ موئے و میانے دارد   بندۂ طلعتِ آں باش کہ آنے دارد

ذوقِ سلیم خود بتائے گا کہ سلمان کے ایں و آں نے شعر کا زور کتنا کم کر دیا اور حافظ کا حکم "بندۂ طلعتِ آں باش" کتنا قوی ہے؟ واقعاتِ عشق بیان کرنے پر آجاتے ہیں تو بدیع الاسلوبی اور بھی مؤثر ہو جاتی ہے۔ خیال یہ ہے کہ جوشِ عشق کو وصل سے بھی سکون نہیں ہوتا۔ وہی سرمستی رہتی ہے اور وہی ولولے۔ البتہ دونوں عالموں میں فرق ہے۔ ہجر میں جلنا مرنا ہے اور وصل میں لذتِ عشق حاصل کرنا۔ دیکھو کس لطف سے تصویر کھینچی ہے :-

بلبلے برگِ گلے خوش رنگ در منقار داشت   و اندریں برگ و نوا خوش نالہائے زار داشت

معشوق عاشق پہ ظلم کرتا ہے۔ پھر پشیمان ہوتا ہے۔ تلافی کرنا چاہتا ہے۔ عاشق سمجھتا ہے کہ یہ کیوں عنایت ہو رہی ہے۔ اس معاملہ کو یوں نظم کیا ہے :-

آفریں بر دلِ نرمِ تو کہ از بہرِ ثواب   کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

غور کرو۔ کس مزے کا طعنہ دیا ہے۔ فلسفیت کا رنگ بھی اسی جوشِ بیان اور بدیع الاسلوبی سے چوکھا ہو گیا ہے۔ اسرارِ کائنات کا معلوم نہ ہو سکنا ایک عام مضمون ہے مگر حافظ جب نظم کرتے ہیں نیا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی یہ خیال آتا ہے کہ جو معلوم ہو جائے وہ راز نہیں اور جو راز ہے وہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ شاعرانہ رنگ میں اس مطلب کے ظاہر کرنے کے لئے ایک لفظ "عنقا" تلاش کر لیا جسکے معنی ہی ہیں معلوم الاسم معدوم الجسم اگر مل جائے تو عنقا نہیں اگر عنقا ہے تو ملے گا نہیں۔ عقل کے لئے اسرارِ کائنات کے علم حاصل کرنیکی کوشش ایسی ہی لغو ہے جیسے عنقا کے شکار کا شوق کہتے ہیں :-

عنقا شکارِ کس نشود دام باز چیں   کانیجا ہمیشہ باد بدست است دام را

ایک لطیفۂ روحانی ہے جو کبھی کاشفِ اسرار ہوتا ہے کبھی مہبطِ انوار۔ نشئہ و خمار۔ مطرب و نغمہ۔ شیشۂ و صراحی۔ نقل و گزک۔ یہ سب مدارجِ عرفان کے نام ہیں۔ بسط کی حالت میں فیضانِ غیب ہوتا ہے۔ لطائف باطنی میں انشراحی حالت آجاتی ہے۔ یہی ان کی بہار ہے۔ نئے نئے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ عجیب عجیب اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی اس بہار کے پھول ہیں اور غنچے۔ پھر بہار بھی وہ جو آنی و فانی نہیں بلکہ ازلی و ابدی ہے۔ اب ذرا اس رنگ میں ڈوب کے حافظ کے اشعار سنو تو دوسرا عالم نظر آئیگا۔ ساقی کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

دیدمش خرم و خنداں قدحِ بادہ بدست ۔۔۔ وندراں آئینہ صد گونہ تماشا میکرد
گفتم ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم ۔۔۔ گفت آں روز کہ ایں گنبدِ مینا میکرد

تصوف کی رضا و تسلیم کبھی کبھی جبریہ کے عقائد سے ملجاتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کیفیت جبر و اختیار دونوں سے بالاتر ہے:۔

بدُرد و صاف ترا کام نیست دم درکش ۔۔۔ کہ ہرچہ ساقیِ ماریخت عینِ الطاف است

اس عالم میں مقامِ فنا کا نام خرابات ہے۔ سالک عارف باخبر قلندر وہ عارف جو مرتبۂ تکلیف سے گذر گیا۔ انسان عالمِ اکبر ہے اگر کامل ہوجائے تو فرشتوں اور آسمانوں سے بلند تر ہے۔ معشوق جلوہ وحدت شہود کا نام ہے۔ خود مٹ جانا وحدت وجود کے درجے تک پہونچنا ہے۔ عرفانِ کامل کو کفر کہتے ہیں (کیونکہ علمائے ظاہر کی نظر میں عارفِ کامل کافر ہوتا ہے)۔ اسلام رواسم ظاہری کا مجموعہ بلکہ ریاکاری کا مخزن (یہ عارف کی نظر ہے جو علمائے ظاہر کے نام نہاد اسلام پر پڑتی ہے)۔ نتیجہ یہ ہے کہ علما کی برائیاں۔ واعظوں کی پردہ دری سب کچھ کی جاتی ہے کیونکہ وہاں استدلال کا زور ہے۔ دلیل مٹی اور دعویٰ ضعیف ہوا۔ یہاں عین الیقین اور حق الیقین کا مرتبہ ہے جو مٹائے سے نہیں مٹتا:۔

اب ہم بخوف طول اتنا اور کہتے ہیں کہ

حسد چہ می بری ای سست نظم بر حافظ   قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد ست

اس کلام کی مقبولیت اتنی ہے کہ لوگ اس سے فال لیتے ہیں اور حضرت خواجہ حافظ رحمۃ کو لسان الغیب اور ترجمان الاسرار سمجھتے ہیں۔ کسی کام کا قصد ہوا اور دیوان کھولا۔ جس شعر پر نظر پڑی وہی حالتِ آئندہ کا ترجمان تھا۔ ملّا مگس نے شاہ اسمٰعیل صفوی کو حافظ سے خلاف کردیا اور چاہا کہ حافظیہ کو مسمار کرادے۔ بادشاہ نے دیوان کھولا تو یہ شعر نکلا:۔

جوز اسحر نہاد حمائل برابرم   یعنے غلامِ شاہم و سوگند میخورم

بادشاہ خوش ہوگیا اور ملّا مگس کا کہنا نہ مانا۔ اب کی ملّا نے دیوان کھولا تو نکلا:۔

ای مگس حضرتِ سیمرغ نہ جولانگہ تست   عرضِ خود میبری و زحمتِ ما میداری

خوش اعتقادوں کا خیال ہے کہ ہمیشہ صحیح فال نکلتی ہے اور روزانہ ہزاروں فالیں دیکھی جاتی ہیں۔ اگر اتفاق بھی مان لیا جائے تو عجیب اتفاق ہے کہ بار بار ظاہر ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب نے قصائد اور مثنویاں بھی نہایت عمدہ کہی ہیں مگر۔

خاموشی از ثنائے تو حدِ ثنائے تست

جامی ملا نور الدین عبدالرحمٰن جامی خراسان کے ایک قریہ جام میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ مطابق ۷۔ نومبر ۱۴۱۴ء کو پیدا ہوئے اور علوم و فنون میں اس حد کا کمال حاصل کیا کہ ہر فن میں صاحب تصنیف ہوگئے اور اپنے اہل عصر میں نہایت معزز اور ممتاز رہے۔ سلطان حسین میرزا آخری چراغ تیموری خاندان کا انکا قدردان تھا سلسلہ تصوّف میں خواجہ عبیداللہ الاحرار نقشبندی سے بیعت تھی سلطان روم نے انکے کمالات

(۶) خرد نامۂ سکندری بوستاں کے رنگ و بحر میں ہے کہیں کہیں سکندر نامہ کا تتبع بھی کیا ہے مگر دونوں سے بہت پست ہے۔ ایک ساقی نامہ اسکا بھی نقل کیا جاتا ہے تاکہ طبیعت کا اندازہ ہو جائے۔

بیا ساقیا ساغر مے بیار — فلک وار دور پیاپے بیار
از ان مے کہ آرائش دل دہد — خلاصی ز آلائش گل دہد
بیا مطربا عود بنہادہ گوش — بیک گوشمال آور اندر خروش
خروشی کہ دل را بہوش آورد — بدانا پیام سروش آورد

(۷) یوسف زلیخا بیشک ان کی مثنویوں میں بے نظیر ہے اور مقامات بزم جس لطف سے بیان کئے ہیں آ سکا مثل فارسی لٹریچر میں مشکل سے ملیگا سال تصنیف ۸۸۸ھ مطابق ۱۴۸۳ء ہے تاریخی اعتبار سے واقعہ بہت سے قصص و روایات کا مجموعہ ہوگیا ہے لیکن شاعری کی قوت اور حسن ادا کی دلکشی ہر کمزوری پر غالب ہے۔ بعض مقامات پر مقتضیات فطرت اس شان سے نظم ہو گئے کہ ضرب المثل ہو گئے ہیں مثلاً:۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد — بسا کیں دولت از گفتار خیزد

اکثر ابواب کی ابتدا براعت استہلال سے کی ہے جو نہایت موثر ہوتی ہے اور افتتاح کلام میں شان پیدا کر دیتی ہے مثلاً جناب یوسف صدیق علیہ السلام کا خواب میں شمس و قمر و کواکب کو سجدہ کرتے دیکھنے کا حال جہاں لکھا ہے اس کی ابتدا یوں کی ہے:۔

خوش آن کز بند صورت باز رستہ — ز سحر چشم بند ال[۱] چشم بستہ
دلش بیدار و چشمش در شکر خواب — ندیدہ کس چنیں بیدار در خواب
بپوشیدہ ز نا پائندہ دیدہ — ولے بگشودہ با پائندہ دیدہ الخ

---

[۱] دنیا کا وجود اہل معنی کی نظر میں وہمی و خیالی ہے جیسے کسی نے نظر بندی کر دی ہے۔

شیخ در صومعہ گر مست شد از ذوقِ سماع
من و میخانہ کہ ایں حال مدام است اینجا
لب نہادی بلبِ جام و ندانم من مست
کہ لبِ لعلِ تو یا بادۂ کدام است اینجا
میکشی تیغ کہ سازی دلِ مارا بدو نیم
تیغ بگذار کہ یک غمزہ تمام است اینجا
کافی

وحدت الوجود کے رنگ میں بھی غزلیں کہی ہیں اور شوخی ادا سے مزہ

بھر دیا ہے :۔

خوباں ہزار و از ہمہ مقصودِ من یکیست ۔ صد پارہ گر کنند بہ تیغم سخن یکیست
آنجا کہ لعلِ دلکشِ شیریں دہد فروغ ۔ یاقوت و سنگ در نظرِ کوہ کن یکیست

بعض اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے عرب کے کلام کا ترجمہ کر دیا ہے۔ مثلاً عمر بن الفارض کا شعر ہے :۔

شربنا علی ذکر الحبیب مدامۃ ۔ سکرنا بھا من قبل ان یخلق الکرم

جامی کہتے ہیں :۔

بودم آں روز من از طائفۂ دُرد کشاں ۔ کہ نہ از تاک نشاں بود نہ از تاک نشاں
(انگور بونے والا)

میرے ایک قابل دوست نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میرے نزدیک جامی کی غزلیں حافظ سے بھی اچھی ہیں مگر افسوس کہ مجھے اس وقت تک اس رائے سے متفق ہونے کا موقع نہ ملا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جامی اس دور کے خاتم الشعرا ہیں۔

خاتمہ

اب شعرائے تیموریہ کا حال ختم کیا جاتا ہے۔ ناظرین نے ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ نثر و نظم دونوں پر کس قدر انقلاب ہوا۔ نثر میں سادگی کم ہونے لگی اور مسجع و مرصع

کرتا ہے اور ۹۲۵ھ میں مرجاتا ہے۔ چند شعر اس کے بھی سُن لو:۔

خوبی ہمیں کرشمۂ وناز وخرام نیست | بسیار شیوہاست بتاں راکہ نام نیست
ایکہ میگوئی چرا جامے بجائے می خوری | ایں سخن باساقئی ماگو کہ ارزاں کردہ است

تصوّف کا رنگ دیکھو:۔

مشکل حکایتے است کہ ہر ذرہ عین اوست | اما نمی تواں کہ اشارت باو کنند
مقصود صحبت است زگل ورنہ بوی گل | انصاف اگر بود ز صبا می تواں شنید
(سونگھ سکتے ہیں)
از فریب نقش نتواں خانۂ نقاش دید | ورنہ درایں سقف رنگیں جز یکے در کار نیست

اپنے معاصرین کے کلام سے کوئی تعلّق ہی نہیں۔ اگر تیموریہ کے عہد آخر میں ہوتا تو عرفی اور فیضی وغیرہ کے ساتھ اس کا ذکر کیا جاتا اور حق تنقید بھی ادا ہوتا۔

ہلالی

اسی طرح اور ایک شاعر ہلالی استرابادی پیدا ہوا۔ یہ چغتائی ترک سادہ گوئی میں بے نظیر تھا اور مضمون آفرینی بھی سلاست زبان کے حدود میں کرتا تھا۔ امیر علی شیر کے دربار میں گیا اور یہ مطلع پڑھا:۔

چناں از پا فگند امروز آں رفتار قامت ہم
کہ فرداں برنخیزم بلکہ فردائے قیامت ہم

امیر خوش ہوا اور تقرب عطا کیا۔ ایک بار عبداللہ ہاتفی نے کہیں کہدیا کہ ہلالی غزل اچھی کہتا ہے۔ مثنوی کہنا ذرا مشکل ہے۔ فوراً شاہ و درویش نظم کرنی شروع کردی جس میں اس واقعے پر بھی اشارہ کیا ہے:۔

مدعی چوں مذاق شعر نداشت | مثنوی را بہ از غزل پنداشت
آنکہ نظم غزل تواند گفت | مثنوی را چو ذر تواند سفت

غرض مثنوی تمام کرکے بدیع الزماں تیموری کو نذر دی اور انعام لیا۔ علاوہ اسکے دو مثنویاں اور نظم کی ہیں لیلیٰ مجنوں و صفات العاشقین۔ جب عبداللہ والیِ خراسان ہوا

باب دہم

صفویہ

صفی

شیخ صفی الدین اردبیلی ایک مشہور خاندان سادات کے سجادہ نشین تھے۔ انکی اولاد میں سلطان حیدر پیدا ہوئے جنکے مرید سرخ رنگ کی ٹوپی بارہ گوشے کی پہنتے تھے۔ یہ لوگ قزلباش کہلانے لگے یعنی "سرخ سر"۔ ان کے

شاہ اسمٰعیل

بیٹے شاہ اسمٰعیل صاحب سطوت ہوئے۔ سلطان حسین مرزا کا زمانہ تھا کہ ۷۰۰ آدمی لیکے آذربائجان پر چڑھائی کی اور فتح پائی۔ پھر اپنی جماعت کو بڑھا کے شروان پر حملہ کیا اور وہاں بھی ظفریاب ہوئے۔ اسی ہنگامے میں شیبانی خاں نے زور پکڑا اور سلطان حسین خاں کی وفات ہوجانے سے خاندان تیموریہ کو مغلوب کرکے ہرات پر قبضہ کرلیا۔ بدیع الزماں[1] پسر سلطان حسین کو سلطنت عثمانیہ میں پناہ لینی پڑی اور وہیں زندگی کے دن پورے ہوگئے۔ شاہ اسمٰعیل نے ازبکوں اور ترکمانوں کا خاتمہ کرنا شروع کیا یہانتک کہ ۲۵ سال کی لگاتار کوشش کے بعد حکومت صفویہ کی مستقل بنیاد ڈال دی جسکا دور سلطنت تقریباً ۱۵۰۰ء سے ۱۷۳۶ء تک رہا۔ اس انقلاب کا نتیجہ ہوا کہ سارے ایران کی ایک متحدہ سلطنت اور ایک متحدہ قوم بن گئی جو آجتک باقی ہے۔ لطف یہ ہے کہ تیموریہ کا زوال صفویہ کے عروج کا باعث ہوا مگر فاتحوں کو تیموریوں کے ساتھ ہمیشہ خلوص رہا۔ ظہیر الدین محمد بابر کو شاہ اسمٰعیل صفوی برابر مدد دیتے رہے بلکہ اگر یہ کمک وقتاً فوقتاً نہ پہونچتی تو تیموریوں کی عظمت ہندوستان میں قائم نہ ہوسکتی۔ غرض سنہ ۹۳۰ھ میں شاہ اسمٰعیل کا انتقال ہوا اور ان کے بیٹے شاہ

---

[1] ہلالی استرابادی نے مثنوی شاہ و درویش اسی کو نذر دی تھی دیکھو صفحہ ۲۵۰۔

قلعۂ قندھار کا کوتوال تھا۔ اس نے اپنے بیٹے محمود خاں کو ایک لشکر دیکے معین کیا
کہ جب بلاؤں چلے آنا۔ ایک دن گرگین خاں قلعہ دار شکار پر گیا اور میرویس نے
محمود خاں کی فوج بلا کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ گرگین خاں جب واپس آیا تو اسے بھی قتل کر ڈالا۔
یہ واقعہ ۱۱۱۹ھ کا ہے۔ شاہ حسین صفوی نے میرویس کی سرکوبی کرنی چاہی مگر جسے بھیجا
وہی قتل ہوا۔ اور میرویس مستقل وارث بن گیا۔ اسکے بعد محمود خاں والئ قندھار رہا۔
اس نے اتنی قوت پیدا کر لی کہ اصفہان پر ۱۱۳۴ھ میں ایک زبردست حملہ کر دیا اور
شاہ طہماسپ آخر
شاہ حسین اور آنکے اعوان و انصار کو (محرم ۱۱۳۵ھ میں) قتل کر ڈالا۔ **شاہ طہماسپ**
پسر شاہ حسین اس غدر کے عالم میں اصفہان کے باہر نکل گیا اور قزوین میں بادشاہ ہو گیا۔
اس کے ملازموں میں سے ایک شخص **نادر قلی** نہایت جوانمرد تھا۔ اس نے بڑے
بڑے کارنمایاں کرنے شروع کئے اور رفتہ رفتہ خراسان فتح کر کے سلطنت قائم کی
اور اپنا نام طہماسپ قلی رکھا۔ اُدھر اشرف شاہ والئ اصفہان (محمود خاں کا بیٹا)
بھی قتل ہوا اور شاہ طہماسپ پھر اصفہان میں فرمانروائے ایران کی حیثیت سے
تخت نشین ہو گیا۔ طہماسپ قلی نے اپنی قوت روزانہ بڑھانا شروع کی آخر ۱۱۴۴ھ
شاہ عباس آخر
میں شاہ طہماسپ کو مقید کر کے اُس کے پسر چار ماہہ **شاہ عباس** کو تخت پر
بٹھایا اور خود مہمات سلطنت سرانجام دینے لگا۔ چار برس کے بعد یہ پردہ بھی
نادر شاہ افشار
ہٹا دیا اور ۱۱۴۸ھ میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور **نادر شاہ افشار**
لقب اختیار کیا۔ سکّے کے ایک رُخ پر تاریخ جلوس **الخیر فیما وقع** بخط طغرا
کندہ کی گئی اور دوسری طرف لکھا گیا۔

سکہ بر زر کرد نام سلطنت را در جہاں — نادر ایران زمین و خسرو گیتی ستاں

مگر کسی دل جلے نے "لاخیر فیما وقع" کو مادہ تاریخ قرار دیا اور نادر نے طغرائی
عبارت موقوف کرا دی۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ یہ شعر کندہ کر لیا تھا۔

اکثر کتابیں تاریخ و تفسیر میں بھی لکھی گئیں مگر فنون لطیفہ خصوصاً فن شعر کی کساد بازاری رہی اور بہترین شعرا ہندوستان چلے گئے جہاں دربار تیموریہ (مغلیہ) میں انکی بڑی وقعت ہوئی۔ بہرکیف چند مصنفین جن کا تعلق دربار صفویہ سے رہا ہے ذکر کئے جاتے ہیں :۔

شفائی

شفائی حکیم شرف الدین حسن نام۔ انکا عروج شاہ اسمٰعیل کے زمانے میں ہوا بلکہ بادشاہ خود ملنے کے لئے انکے گھر پر گیا جناب میر باقر داماد بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اصفہان ان کا وطن تھا اور وہیں فن طبابت میں مشغول رہتے تھے۔ مثنوی نمکدان حقیقت کو حدیقہ سنائی کی بحر میں نظم کی ہے جس میں بقول مولانا شبلی تصوف کے معرکہ آرا مسائل بیان کئے ہیں۔ ایک دیوان غزلوں کا بھی چھوڑا ہے جو بقول صاحب مجمع الفصحا "شیرین" ہیں اور اکثر فغانی کی بحروں میں کہی ہیں۔ رنگ طبیعت ملاحظہ ہو :۔

بدوستی تو خصمند عالمے با من ہزار دشمن و یکدوست مشکل افتاد ست
زگرد بادیہ این ہمرہی نمی آید غبار کیست کہ دنبال محمل افتاد ست

یہ شعر خوب کہا ہے :۔

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را چندان اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

ایک حالت نظم کی ہے :۔

شفائی را تمام عمر در راہ تو می بینم یکو بیت میروید از سر کوئے تو می آید

نمکدان حقیقت سے بھی چند اشعار منتخب کئے جاتے ہیں جن میں انسان کو بحیثیت اشرف المخلوقات مخاطب کیا ہے :۔

ای تو آئینہ تجلی ذات نسخۂ جامع جمیع صفات
در نمود تو ذات مستور است ذات مختفی صفات مذکور است

از تو نماندہ تاب جدائی دگر مرا — بہر خدا مرو بسفر یا ببر مرا

نادیدہ کرد تا نکنم عزم ہمرہی — آن مہ چو دید وقت سفر در گذر مرا

معشوق نظر بچا گیا — راہ ۱۲

گر قصد آن نداشت کہ گردم زغم ہلاک — بہر چہ کرد از سفر خود خبر مرا

عزم سفر نمودہ و ترسم کہ در دو روز — سازد بعشق شہرۂ شہر دگر مرا

قاصد امباد چون شرف از خویشتن بردم — آگہ مکن ز آمدنش پیشتر مرا

ایران میں انکی طرز سے زیادہ مشہور و مقبول ہوئی۔ اسی وجہ سے تخییلی رنگ رفتہ رفتہ مٹنے لگی۔

وحشی

وحشی دورۂ صفویہ کے غزل گویوں کا سرتاج ہے۔ کرمانشاہ کے قریۂ بافق کا رہنے والا۔ اکثر یزد میں زندگی بسر کرتا تھا اسی سے یزدی مشہور ہوگیا۔ زندگی شاہدان بازاری کے عشق میں کاٹی اور دم بھی نکلا تو شراب پیتے پیتے (آتشکدہ)۔ مرتے وقت یہ شعر نظم کیئے:-

"زشبہاے دگر دارم تب غم بیشتر امشب — وصیت می کنم باشید از من باخبر امشب"

مگر در من نشان مرگ ظاہر شد کہ می بینم — رفیقان را نہانی آستین بر چشم تر امشب

صاحب آتشکدہ لکھتے ہیں کہ تین مثنویاں نظم کیں۔ مخزن اسرار کی بحر میں خلد برین، شیرین و خسرو کے مقابل ناظر و منظور۔ اور ایک مثنوی اسی بحر میں فرہاد و شیرین نظم کی جو ناتمام رہ گئی۔ غزلیں نہایت رنگین کہی ہیں اور واردات عشق کے نظم کرنے میں استاد ہے۔ قصائد شاہ طہماسب اول کی مدح میں نظم کیئے ہیں اور ائمہ اہلبیت کا بھی مداح ہے۔ اکثر قدما کی بحروں میں خامہ فرسائی کی ہے مگر چونکہ واقعہ گوئی کا عادی ہے اور قصیدے میں قوت تخییل کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے لہذا پھیکا پڑجاتا ہے بعض تخییلی اشعار ہمارے نقل کیے جاتے ہیں جو محاکات سے عاری ہونے کی وجہ سے بدرنگ ہوگئے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

نہ جانتا۔ غزل کے چند مصرعے دردِ دل بیان کرنے کو جب کافی نہ ہوئے تو بند کے
بند کہہ ڈالے اور بعد کو کوئی شاعر تقلید تک بھی پوری طور سے نہ کر سکا:-

دوستان حالِ پریشانئ من گوش کنید   داستانِ غمِ پنہانئ من گوش کنید
قصۂ بے سر و سامانئ من گوش کنید   گفتگوئے من و حیرانئ من گوش کنید

شرح این قصۂ جانسوز نگفتن تا کے
سوختم سوختم این راز نہفتن تا کے

روزگارے من و دل ساکن کوئے بودیم   ساکنِ کوئے بتِ عربدہ جوئے بودیم
دین و دل باختۂ دیوانۂ روئے بودیم   بستۂ سلسلۂ سلسلہ موئے بودیم

کس دران سلسلہ غیر از من و دل بند نبود
یک گرفتار ازین جملہ کہ ہستند نبود

نرگسِ غمزہ زنش اینہمہ بیمار نداشت   سنبلِ پرشکنش ہیچ گرفتار نداشت
اینہمہ مشتری و گرمیِ بازار نداشت   یوسفے بود ولے ہیچ خریدار نداشت

اوّل آنکس کہ خریدار شدم من بودم
باعثِ گرمیِ بازار شدم من بودم

عشقِ من شد سببِ خوبی و رعنائیِ او   داد رسوائیِ من شہرتِ زیبائیِ او
بسکہ کردم ہمہ جا شرحِ دل آرائیِ او   شہر پر گشت ز غوغائے تماشائیِ او

این زمان عاشقِ سرگشتہ فراوان دارد
کے سر و برگِ من بے سر و ساماں دارد الخ

ولی دشت بیاضی

ولی دشت بیاضی[۱] بھی وحشی کا معاصر اور انھی کے رنگ میں کہتا ہے۔

۱؎ قائن ایک صوبہ ایران کا ہے۔ اسکے مضافات میں ایک قریہ ہے جہاں کی مٹی سفید ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے دشت بیاض کہلاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ محتشم کی غزلوں کا رنگ تو بیشتر وہی ہے جو دورِ صفویہ میں رائج تھا یعنے واردات عشق بیان کرنا مگر بیان میں نہ جوش ہے نہ سوز وگداز اسی وجہ سے کسی قدر کلام پھیکا رہتا ہے۔ البتہ قصیدہ گوئی میں ان کا پایہ کسی قدر بلند نظر آتا ہے مگر وہ بھی ایران کے اندر ورنہ عرفی وغیرہ کے مقابلے میں لانا ہی بیکار معلوم ہوتا ہے کیونکہ نہ تو شوکت الفاظ ہے اور نہ طبیعت زوردار۔ ہاں اتمہید میں نئی نئی ایجاد کی ہیں مثلاً:۔

دہندۂ کہ بہ گل نکہت و بہ گل جان داد | بہر کہ ہر چہ سزا بود حکمتش آن داد
بعرش رتبۂ عالی بفرش پایۂ پست | ز روی مصلحت و رای مصلحت (خدا) دان داد
دو کشتی متساوی اساس را در بحر | یکے رساند بہ ساحل دگر بطوفان داد
دو سالک متشابہ سلوک را در عشق | یکے نوید بوصل و دگر بہ ہجران داد[1]

اسی طرح گنواتے جاتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں:۔

چو پادشاہی اقلیم صورت و معنی | زیادہ در پدر شاہاں بہ میرمیراں داد

اصل کمال ان کا مرثیہ گوئی میں ہے۔ واقعات کربلا ایک خاص طرز (ممدوح) میں نظم کئے ہیں بعض بند نقل کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ واقعی اس سانحہ پر جو شعر بنے ان کے دل پر چوٹ لگی ہے جبھی دل ہلا دینے والے شعر نکل رہے ہیں:۔

باز ایں چہ شورش است کہ در خلق عالم است | باز ایں چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است
باز ایں چہ رستخیز عظیم است کز زمیں | بے نفخ صور خاستہ تا عرش اعظم است
گویا طلوع میکند از مغرب آفتاب | کاشوب در تمامی ذرات عالم است
گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست | ایں رستخیز عام کہ نامش محرم است
در بارگاہ قدس کہ جای ملال نیست | سرہای قدسیاں ہمہ بر زانوی غم است

---

[1] یہ شعر ادیب کے شعر کا تقابل بہت اچھا ظاہر کرتا ہے۔

ہوئی۔ علاوہ بریں یہ بھی نقل کیا ہے کہ ملک شام میں جو پتھر اٹھایا جاتا تھا خون تازہ جوش مارتا ہوا نکلتا تھا۔ اور ایسے ہی بکثرت روایات شاعر کے پیش نظر ہیں جن پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے اور اسی جوش مذہبی میں مرثیہ کہتا ہے۔ ہم پیشتر لکھ چکے ہیں کہ مرثیہ کے خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اپنے جوش قلب کی سچی تصویر کھینچے۔ مرنے والے کی عظمت اور خصوصیات ایسے الفاظ میں ظاہر کرے کہ دوسرے بھی متاثر ہو جائیں صحن عالم میں جو چیز ہو اسے شریک غم کر لے۔ اور سارے عالم کو مرنے والے کا سوگوار بنا لے یہ سب امور اس واقعہ ہائلہ میں علی وجہ الکمال موجود ہیں۔ کیونکہ اہل اسلام[1] کی نظروں میں خود یہ دن ہولناک اور اندوہناک معلوم ہوتا ہے۔ مقتول کی عظمت ایسی ہے کہ سب کے قلوب متاثر ہیں۔ عالم بھر حقیقت میں سوگوار ہے۔ ایسی حالت میں مرثیہ ضرور پرتاثیر ہو جائیگا بشرطیکہ شاعر سلیقہ نظم درست رکھتا ہو اور فصاحت و بلاغت کے مقامات کی پوری رعایت کرتا ہو۔ کسی شاعر نے داب نظم اور نتیجہ مرثیہ کو خوب ایک شعر میں ادا کر دیا ہے:۔

دبدبہ بھی ہو فصاحت بھی ہو توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

سحابی

سحابی استر آبادی۔ جرجانی الاصل شوستر میں پیدا ہوا اور نجف اشرف میں متوطن ہو گیا۔ شاہ عباس اعظم کا ہمعصر ہے اور فن شعر میں خیام ثانی۔ ۱۰۱۲ھ اس کی تاریخ وفات لکھی ہے (مجمع الفصحا) اسکی رباعیاں اس دور کی بہترین یادگار ہیں۔ خیام کے وقت سے یہ صنف شعر محض تفنن طبع کے کام میں آتی تھی سحابی

---

[1] دیکھو صحیح ترمذی۔ روایات ابن عباسؓ و ام المومنین ام سلمہؓ وغیرہ اور صواعق ابن حجر متعلق احادیث فضائل عاشورہ۔

صوفی تو بکارِ خویش رہ کاین رہ را　　پا بر سرِ خود نہادہ می خواہم

اسکی جویائی نہ مرشد کی محتاج ہے۔ نہ راہبر کی۔ یہ اپنے ہی وجود کو راہبر بھی سمجھتا ہے اور مطلوب بھی۔ اسکو مطلوب کی تلاش میں کہیں جانا ہی نہیں:۔

آنم کہ ندارم بدو عالم کامے　　نا یافتہ جز پیکِ وجود آرامے

گر خلقِ جہان جملہ چو من بودندے　　لازم نشدے رسولے و پیغامے

اس کا جوش اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ایک تو گمراہ ہونے کا کھٹکا ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو مطلوب ہی سے کہتا ہے کہ اگر میں کھو جاؤں تو تو خود ڈھونڈ نکال تاکہ ہر رنگ میں تیرا ہی نظر آؤں۔ ہاں! اگر تو نے جستجو نہ کی تو پھر کھو جاؤنگا:۔

گم گردم اگر تو جستجویم نکنی　　آئینہ صفت روی بہ رویم نکنی

در حق خود از لطفِ تو گفتم بسیار　　یا رب یا رب دروغ گویم نکنی

شیخ بہائی

شیخ بہائی۔ حضرت بہاؤالدین عاملی شباب دولت صفویہ کے زمانے میں عالم جلیل القدر تھے اور پائے تخت میں شیخ الاسلام کا مرتبہ رکھتے تھے۔ درویشی اور سیاحت کی طرف رغبت ہوئی تو بیس برس اسی میں صرف کر دئے اور حج و زیارت عتبات عالیات سے بار بار مشرف ہوئے۔ انھیں سفروں میں ایک بار ایک روز جہاز پر رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس دن ایک مختصر مثنوی مولانا روم کی بحر میں نظم کر ڈالی۔ اور مولانا کو آخر میں یاد بھی کیا:۔

قُم و زمزم لی باشعارِ العجم　　کی تروح الروح من تم و غم

وابتدأ منہا ببیتِ المثنوی　　للحکیم المولوی المعنوی

بشنو از نے چون حکایت میکند　　وز جدائیہا شکایت میکند

اس مثنوی کا نام نان و حلوا ہے اس میں دنیوی لذات کا روحانی لذات سے مقابلہ کیا ہے اور اچھا کیا ہے۔ اشعار عربی میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی۔ معشوق

بادشاہ نے اسے سونے میں تلوا دیا۔ آخر عمر میں مشہد مقدس کا مجاور ہوگیا اور ۱۰۲۳ھ میں رحلت کی۔ غزل گوئی میں زمانے کا رنگ غالب ہے وہی واقعات عشق مجازی کا نظم کرنا اور شیریں ادائی سے زبان کو دلکش بنا لینا:۔

دیگراں را در گرفتاری شریک ما مکن

مدعا گر شہرت حسن است یک رسوا بس است

غرض دورۂ صفویہ میں جتنے اقسام کی شاعری ظہور میں آئی اُن سب کے نمونے ہم اس باب میں ذکر کر چکے ہیں لیکن سرزمین ایران کے نازک خیال ایران میں اس زمانے میں قیام نہ کر سکے اور ہندوستان چلے گئے۔ ان کے یہاں نازک خیالی فلسفہ طرازی۔ سوز و گداز اور تصوف کی بہترین مثالیں ہیں مگر چونکہ نشو و نما ہندوستان میں ہوئی اور وہیں یہ اسالیب کامیاب ہوئے لہذا ان سب کا ذکر آئندہ باب میں کیا جائیگا۔ صفویہ خاندان کے سلاطین اور شہزادے بھی شاعر اور مصنف تھے خصوصاً شہزادہ سام میرزا کا تذکرۂ سامی نہایت معتبر ہے اور اکثر مصنفات حال میں اس سے استناد کیا گیا ہے۔ اشعار بھی نہایت صاف کہے ہیں چنانچہ بعض بہت مشہور ہیں مثلاً۔

سام میرزا

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم — شادم از زندگئ خویش کہ کارے کردم

اسی طرح القاص میرزا پسر شاہ اسمٰعیل اول۔ مصطفٰے میرزا پسر زادہ شاہ طہماسپ اول۔ بہرام میرزا برادر شاہ طہماسپ وغیرہ بھی شاعر تھے۔ شاہ اسمٰعیل بانی دولت صفویہ خود بھی نہایت خوشگو تھے اور خطائی تخلص کرتے تھے طبیعت کا اندازہ اس شعر سے ہو جائیگا:۔

بے ستوں نالۂ زارم چو شنید از جا شد — کرد فریاد کہ فرہاد دگر پیدا شد

شاہ عباس اعظم کے اشعار بھی مشہور ہیں۔ شاہ طہماسپ انکے باپ عادل تخلص

سنہ ۱۱۰۱ھ میں انتقال فرمایا اور عربی میں افق المبین وغیرہ نادر کتابیں چھوڑیں۔ فارسی میں ایک رسالہ **جذوات** اس وقت پیش نظر ہے جس میں حقائق حکمت و معرفت بیان فرمائے ہیں۔ عبارت دقیق ہے اور عربیت سے لبریز۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"اول مرتبۂ عقول محض کہ انوار عقلیۂ قاہرہ اند و در عرض این مرتبہ اشرف واتم و ابہی و اقدم عقل نخستین کہ صادر اول و اسبق اشعۂ تنزلات نور الانوار اوست و باصطلاحی او را عقل کل گویند"

میرزا محمد رفیع واعظ

میرزا محمد رفیع واعظ قزوینی گیارھویں صدی کے آخر میں گذرے ہیں۔ انکی کتاب **ابواب الجنان** مواعظ میں بے نظیر ہے۔ انشا پردازی شیریں ہے۔ قافیہ و وزن کا حسب دستور زمانہ التزام ہے اور استعارات و تخییل سے ہر بیان وابستہ ہے لیکن مضامین کی بنیاد سراسر قرآن و حدیث پر ہے اور حکایات بھی مذہبی روایات ہیں۔ اس کا نمونہ بھی دیکھو۔ اہل قبور کے حال میں لکھتے ہیں:۔

"در زیر پائے ما بینک دو ذرع فاصلہ چہ خبر و چہ صحبت۔ و در ین شگافہائے زہرہ شگاف چہ ولولہ و چہ وحشت است۔ ابنائے جنس مایند کہ با خاک تیرہ یکسان گشتہ اند۔ اقران و امثال مایند کہ نالۂ پر حسرت شان بزبان حال از فلک گذشتہ۔ گردن کشانند سر بگریبان مذلت کشیدہ و سخت مردانند بسنگ صعوبت اجل نرم گردیدہ"

منشی سکندر

منشی سکندر نے تاریخ عالم آرائے عباسی دولت صفویہ کے حال میں شاہ عباس اعظم تک سنہ ۱۰۳۸ھ تا سنہ ۱۰۲۶ھ کے زمانے کی لکھی اور انشا پردازی کا نشان بلند کیا۔ ظفر نامہ سے عبارت مشابہ ہے۔ فقرے الجھے بھی ہیں سلجھے بھی ہیں۔ استعارات کا رنگ کہیں گہرا ہے کہیں ہلکا۔ ترکی الفاظ ضرورت سے زائد داخل کر کے غرابت پیدا کر دی ہے۔ بالکل سادگی کہیں نہیں۔ آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے

نادرشاہی اور بعد کے ہنگامے اسے وطن آوارہ کئے رہے۔ اسی دوران میں حج و زیارات وغیرہ سے فراغت کی۔ فن شعر میں میر سید علی مشتاق کا شاگرد ہے۔ قصیدہ گوئی میں کریم خاں زند وغیرہ کا مداح ہے۔ غزلیں اچھی کہتا ہے۔ ایک مثنوی یوسف زلیخا بھی نظم کی ہے جو آتشکدہ کے آخر میں نقل ہے۔ نثر میں اس کا آتشکدہ تذکرہ شعرائے فارسی میں یادگار ہے۔ صاف اور سلیس زبان میں حالات شعرا بالخصوص اپنے ہم عصروں کے حال اچھے لکھے ہیں۔ انتخاب کلام بیشک بہت اچھا نہیں ہے اور ان شعرائے ایران سے کدورت معلوم ہوتی ہے جو ہندوستان چلے آئے حالانکہ حسب تصریح مجمع الفصحا آتشکدہ خود ہندوستان میں تصنیف ہوا۔ مثنوی یوسف زلیخا میں سے اس مقام سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جہاں زنان مصر نے حسن یوسف سے مبہوت ہو کے انگلیاں کاٹ ڈالیں :-

زبان او است چون از تیغ شد ریش   زلیخا این سخن میگفت با خویش

چه بودے یارب این کج تخم خو بها   بجائے کف برید ندے زبانہا

کسے را کاتش عشقے بجان است   زکس تا نیستش رشکے نہان است

چو آید پائے غیرے در میانہ   کشد آن آتش پنہان زبانہ

یہ نمونہ اس مثنوی کے بہترین اشعار کا ہے۔ چند اچھے شعر غزلوں سے بھی منتخب کئے جاتے ہیں :-

دہم مژدن شدی و مساز چوں من ناتوانے را
مراگہ زندہ کردی گشتی از رشکم جہانے را

باں درخت زباں یارب از خزان مرساد
کہ زیر سایۂ خود مرغ بے پرے دارد

مطرب امشب نالہ ہم کردہ است نائے میزند
درمیان نالہ حرف آشنائے میزند

باب یازدہم

ہندیہ

فارسی کی وسعت

اس وقت تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ زبان کی اُنھیں لطافتوں تک محدود ہے جنکی نشو و نما سرزمین عجم میں ہوئی۔ اکثر نازک محاورے اور شیریں فقرے اور جملے ایرانی آب و ہوا میں پرورش پا کے فارسی کا جزو بنے۔ کبھی اسم و فعل ملا کے محاورات پیدا کیئے گئے جیسے دم زدن (خاموش ہو جانا)۔ دراز کشیدن (پاؤں پھیلا کے لیٹنا)۔ ترآمدن (شرمانا)۔ سرکردن (شروع کرنا)۔ کبھی حرف و فعل کی ترکیب سے جیسے درافتادن (لڑنا)۔ برافتادن (شکست کھانا)۔ درگرفتن چراغ (چراغ کا بھڑکنا)۔ اسی طرح اور متعدد ترکیبیں پیدا کی گئیں اور دلکش و دل نشین محاورات ترتیب دیئے گئے مثلاً دل تنگی (غمگینی)۔ پاداری (استقلال)۔ برہمی بے ترتیبی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ وسعت زبان بیشتر قوت تخییل کے ذریعے سے ہوئی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ فارسی زبان کی وسعت کا بیشتر حصہ وہی ہے جو دامنِ شاعری کے سایہ میں پلا ہے محاکات نے بھی محاورات بنانے میں اچھی خاصی مدد دی۔ تم دیکھتے ہو کہ جب کوئی شخص خاموش ہو جاتا ہے اور ہزار کہو مگر نہیں بولتا۔ اُس وقت جھنجھلا کے اُنگلی اُسکے ہونٹ پر مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بولتا کیوں نہیں۔ ایرانی نے اسکی تصویر کھینچ کے محاورہ بنا لیا۔ "ہر چند انگشت بر لبش زدم۔ حرفے از زبانش برنیامد" اسیطرح جہاں ہم بولتے ہیں کہ جان پر آبنی۔ ایرانی کہتا ہے "کارد باستخوان رسید" سہل بات کو "پیش پا افتادہ" کہدیتا ہے۔ جرم کھل جانے کے مقام پر کہتا ہے "تختہ از روے کارش افتاد" غرض تخییل و محاکات کی قوتوں سے بہت بڑا ذخیرہ کنایوں

جب قدرت کے بچھڑے ہوئے ملتے ہیں تو تپاک بڑھ جاتا ہے۔ فارسی زبان
جب آرین قوم کے پاس واپس آئی تو ایک صورت یکجہتی کی اور نکل آئی۔ یعنے
بعض چیزوں کے ہندی نام ترک کر کے فارسی نام وضع کئے گئے اگرچہ ایران میں
بھی انکے نام موجود تھے مگر آریا درت اپنی فارسی چاہتا تھا مثلاً چمٹا دست پناہ
کہلایا۔ اگرچہ آتشگیر ایران میں نام موجود تھا اور بے تکلفی اتنی بڑھی کہ دسپنارہ گیا
یعنے ہندی لباس پہن لیا)۔ ہاتھوں کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں جو چیز
پہنتے تھے ہندوستان میں اُس کا فارسی نام "دستانہ" رائج ہوا اور ایرانی اپنی زبان
چھوڑ کے ترکی لفظ "قُلچاق" بولنے لگے۔ کپڑوں کے نام تن زیب۔ جامدانی۔
کامدانی وغیرہ۔ یا عہدوں کے نام برق انداز۔ جمعدار۔ رسالدار وغیرہ
ہندوستان میں رائج ہوئے۔ اسی طرح سند قبض الوصول ہمارے ملک میں رسید
کہلانے لگی اور مرکب کا نام روشنائی ہو گیا۔ تخیل و محاکات کے زبردست قانون
تو موجود ہی تھے۔ لہذا یہاں بھی ہر روز نئے نئے استعارات و تشبیہات پیدا ہونے
لگے جن کی ایرانیوں کو خبر بھی نہ ہوئی اور رفتہ رفتہ جزو زبان ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
ہندوستان کی فارسی ایران کی فارسی سے جدا ہو گئی۔

دورۂ غزنویہ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ مسعود سعد سلمان کا مستقل قیام
پنجاب میں ہوا اور انکی نظم و نثر فارسی بیشتر یہیں مرتب ہوئی۔ خاندان اسلام کے
ساتھ ہر عہد اور ہر دور میں علما و فضلا، شعرا و مورخ، اہل صنعت و حرفت وغیرہ
یہاں آتے جاتے رہے اور انکی فارسی پر ہندوستانی رنگ بھی چڑھتے رہے۔
نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے فارسی لٹریچر کا ارتقاے فطری یہاں کے مذاہب و رواسم۔
آب و ہوا اور تمدن سے متاثر ہو کے ہوا اور فطرۃً ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ
کا انگریزی لٹریچر بالکل انگلستان کے لٹریچر سے جدا ہے بلکہ انگلینڈ۔ اسکاٹلینڈ

موزونیٔ طبع کے آثار بچپن ہی میں ظاہر ہونے لگے اور کچھ نہ کچھ نظم کرنا شروع کر دیا۔ درسیاتِ عربی و فارسی ختم کرنے کے بعد کشلو خاں (معروف بہ چھجو خاں) کا تقرب حاصل ہوا (یہ زمانہ غیاث الدین بلبن کا تھا) ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (پسر بلبن) کے دربار میں بیٹھے تھے اور شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ امیر خسرو نے جو اشعار اپنی خاص دھن میں پڑھے تو شہزادہ نے خوش ہو کے ایک لگن بھر کے روپے عطا کئے۔ چھجو خاں کو یہ عطیہ لینا ناگوار ہوا اور امیر صاحب مجبوراً بغرا خاں کے ساتھ ہو گئے۔ پھر سلطان محمد قاآن (بلبن کے بڑے بیٹے) نے انھیں اپنے شعرائے خاص میں داخل کیا۔ اسی زمانے میں ارغون خاں (نبیرۂ ہلاکو خاں) کی طرف سے تیمور خاں نے لاہور پر حملہ کیا اور فتح و غارت کرتا ہوا ملتان تک آ گیا۔ یہاں سلطان محمد قاآن نے نہایت جوانمردی سے مقابلہ کیا مگر اتفاق سے ایک تیر ایسا کاری لگا کہ جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ امیر خسرو اور حسن دہلوی بھی اس معرکے میں شریک تھے۔ تاتاری ان دونوں کو قید کر کے بلخ لے گئے جہاں انھوں نے ایک پُر درد مرثیہ میں یہ واقعات نظم کئے۔ دو برس کے بعد دہلی واپس آئے اور بلبن کے دربار میں مرثیہ پڑھا تو کہرام مچ گیا اور بادشاہ کو روتے روتے بخار آ گیا جس سے جانبر نہ ہوا۔ بلبن کے انتقال کے بعد خلاف وصیت کیقباد (پسر بغرا خاں) کو امرائے دولت نے تخت پر بٹھا دیا۔ یہ عیاشی میں مصروف ہو گیا۔ بغرا خاں نے جو سنا تو بنگال سے دہلی کی طرف چلا۔ کیقباد نے باپ کا مقابلہ کیا۔ آخر صلح ہوئی اور کیقباد دہلی واپس آیا۔ امیر خسرو نے کیقباد کے کہنے سے یہ واقعات ایک مثنوی میں نظم کئے جس کا نام قرآن السعدین ہے۔ یہ تصنیف ۳۶ برس کی عمر کی ہے اور سال اختتام ۶۸۸ھ۔ کیقباد کے بعد اس کا کمسن بچہ شمس الدین کیکاؤس (۶۸۹ھ میں) بادشاہ ہوا مگر اُسے قید کر دیا گیا اور جب خاندان میں کوئی دعویدار نہ ہوا تو ملک فیروز شائستہ خاں نے جلال الدین خلجی لقب اختیار کر کے سلطنت پر قبضہ کیا۔ اس کا جاہ و جلال

دیکھ رہے تھے کہ زبان سے نکلا :-

ہر قوم راست دینے راہے وقبلہ گاہے

خواجہ صاحب ٹوپی ذرا ٹیڑھی دیئے ہوئے تھے۔ خسرو نے برجستہ کہا :-

من قبلہ راست کردم بر طرفِ کج کلاہے

حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو سے زیادہ جامع شاعر[1] شاید ہی کوئی ہوا ہو مثنوی (رزمیہ و صوفیہ دونوں) قصیدہ۔ غزل۔ قطعہ۔ رباعی۔ مستزاد۔ مرثیہ۔ غرض ہر صنف کو نظم کیا ہے اور نہایت خوب نظم کیا ہے۔ ہندوستان کا ذکر تو کیا۔ ایرانی شعرا بھی عزت سے یاد کرتے ہیں شیخ سعدی کے دل پر انکے کلام کا اچھا اثر تھا (اگرچہ ملاقات کے لئے شیراز سے دہلی یا بنگال آنا ثابت نہیں) ملا جامی کہتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ خود کہتے ہیں کہ مثنوی میں نظامی۔ غزل میں سعدی۔ مواعظ و حکمیات میں سنائی و خاقانی۔ قصائد میں کمال اسمٰعیل و رضی نیشاپوری کی تقلید کرتا ہوں۔ انکی شاعری کے خصوصیات مجملاً یہ ہیں کہ جس اتباع کا دعویٰ کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے مگر تشبیہات و استعارات جدیدہ اکثر پیدا کئے ہیں اور قدما کی طرز سے جدائی اختیار کی ہے۔ غزل گوئی میں نازک خیالی۔ واقعہ نگاری۔ واردات عشق کا ذکر سب کچھ موجود ہے بلکہ فن موسیقی میں کمال[2] ہونے کی وجہ سے بحریں اس قدر مناسب اختیار کی ہیں کہ کلام کا اثر دو چند ہو جاتا ہے خصوصاً واقعہ نگاری تو بیحد مؤثر ہوتی ہے۔ اب ہم ہر صنف کے نمونے نقل کرتے ہیں :-

قصیدے میں ندرت تخیل زائد درکار ہوتی ہے اور مطالع و مخالص بالخصوص

---

[1] ایک مثنوی میں خسرو نے شہاب کے اصلاح لینے کا اقرار کیا ہے مگر یہ استاد صاحب بالکل غیر معروف ہیں اور انکے حالات کہیں نہ مل سکے۔

[2] موسیقی میں استاد کامل تھا ایرانی و ہندوستانی سروں کو ملا کے متعدد دلکش راگ ایجاد کئے اور اپنے زمانے کے کامل کلاونت گوپال کو اپنے کمال کا قائل کرا دیا (دیکھو شعر العجم جلد دوم)۔

دیکھ رہے تھے کہ زبان سے نکلا:۔

ہر قوم راست دینے راہے و قبلہ گاہے

خواجہ صاحب ٹوپی ذرا ٹیڑھی دیئے ہوئے تھے۔ خسرو نے برجستہ کہا:۔

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہے

حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو سے زیادہ جامع شاعر[1] شاید ہی کوئی ہوا ہو مثنوی (رزمیہ وصوفیہ دونوں)۔ قصیدہ۔ غزل۔ قطعہ۔ رباعی۔ مستزاد۔ مرثیہ۔ غرض ہر صنف کو نظم کیا ہے اور نہایت خوب نظم کیا ہے۔ ہندوستان کا ذکر تو کیا۔ ایرانی شعرا بھی عزت سے یاد کرتے ہیں شیخ سعدی کے دل پر انکے کلام کا اچھا اثر تھا (اگرچہ ملاقات کے لئے شیراز سے دہلی یا بنگال آنا ثابت نہیں) ملا جامی کہتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں کہا۔ خود کہتے ہیں کہ مثنوی میں نظامی۔ غزل میں سعدی۔ مواعظ و حکمیات میں سنائی و خاقانی۔ قصائد میں کمال اسمعیل و رضی نیشاپوری کی تقلید کرتا ہوں۔ انکی شاعری کے خصوصیات مجملاً یہ ہیں کہ جس اختراع کا دعوی کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے مگر تشبیہات و استعارات جدیدہ اکثر پیدا کئے ہیں اور قدما کی طرز سے جدائی اختیار کی ہے۔ غزلگوئی میں نازک خیالی۔ واقعہ نگاری۔ واردات عشق کا ذکر سب کچھ موجود ہے بلکہ فن موسیقی میں کمال[2] ہونے کی وجہ سے بحریں بھی اس قدر مناسب اختیار کی ہیں کہ کلام کا اثر دوچند ہو جاتا ہے خصوصاً واقعہ نگاری تو بیحد موثر ہوتی ہے۔ اب ہم ہر صنف کے نمونے نقل کرتے ہیں:۔

قصیدے میں تخیل زائد درکار ہوتی ہے اور مطالع ومخالص بالخصوص

---

[1] ایک مثنوی میں خسرو نے شہاب سے اصلاح لینے کا اقرار کیا ہے گریہ استاد صاحب بالکل غیر معروف ہیں اور انکے حالات کہیں نہ مل سکے۔ [2] موسیقی میں اس قدر کمال تھا کہ ایرانی و ہندوستانی سروں کو ملا کے متعدد دلکش راگ ایجاد کئے اور اپنے زمانے کے کامل کلاونت گوپال کو اپنے کمال کا قائل کرا دیا (دیکھو شعر العجم جلد دوم)۔

مثنویاں جن مضامین میں لکھی ہیں نہایت خوب ہیں البتہ ایک بات ہے کہ اصل واقعہ سے ہٹ کے دوسری باتیں بیان کرنے لگتے ہیں اور ان میں ذرا طول دیدیتے ہیں اس کمزوری کا خود بھی اعتراف کرتے ہیں :۔

وصف بر آنگونہ فرو راندہ ام | کز غرضِ قصہ فرو ماندہ ام

لیکن یہ بات زیادہ تر قرآن السعدین میں ہے اور مثنوی کا مضمون بھی باپ بیٹے کی لڑائی کو سراہنا جو خود لغو ہے۔ یہ بھی خسروؔ کا کمال تھا کہ ایسی بے سروپا بات اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں لطف سے نظم کردی۔ دیکھو بیٹے کی زبان سے استحقاق سلطنت باپ کے مقابلے میں ثابت کرتے ہیں :۔

گر بہ گُہر تاج ستانِ توام | عیب مکن گوہرِ کانِ توام
ور ہوسِ تاج ترا در سر ست | من گُہرم تاج مرا در خور ست

اس کے بعد اُس نے اپنی شجاعت و سطوت کا ذکر کیا ہے۔ باپ کی طرف سے جواب محبت پدری میں ڈوبا ہوا جاتا ہے :۔

اے ز نسب گشتہ سزائے[1] سریر | ور بہ پسری ہیچو پدر بے نظیر
گرچہ[2] غبار ست ز کارِ توام | سرمۂ چشم است غبارِ توام
گرچہ توانم ز تو ایں پایہ بُرد | از تو ستانم بہ کہ خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایّام تو | من ز تو و نام من از نامِ تو

پھر محبت پدری کا اظہار کیا ہے کہ جس کو پڑھ کے بیٹے کا دل بھی تڑپ گیا ہے اور دونوں باہم آکے ملے ہیں۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ نظامی کے مقابلے میں مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینہ اسکندری بالکل پھیکی اور

---

[1] لائق۔ [2] اگرچہ تیرے مقابلے سے میرے دل پر غبار آگیا ہے مگر چونکہ تو میرا ہی لخت جگر ہے لہذا یہ غبار بھی میرے لئے سرمۂ چشم ہے۔

بحر کا انتخاب کتنا اثر پیدا کر رہا ہے :-

داد من آں بت طراز نداد   پاسخے نیز دلنواز نداد

خواب ما را ببست و باز نکرد   دل ما را ببرد و باز نداد

تو چہ دانی نیازمندی چیست   چوں خدایت بکس نیاز نداد

جدت اسلوب اتنی شوخ ہے کہ اسکی مثال سعدی کے یہاں بھی دشواری سے ملے گی۔ خیال یہ ہے کہ معشوق کی طرف سے ظلم و ستم ہوتے ہیں اور پھر بھی پیارا ہے۔ خصوصاً اگر تصوف کے رنگ میں دیکھا جائے تو بات کہاں سے کہاں جاتی ہے۔ اب ذرا غزل کی طرز ادا کو دیکھو :-

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز   دردہا دادی و درمانی ہنوز

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ   نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یا یہ خیال دیکھو کہ لوگ کہتے ہیں کہ تم عاشق کیوں ہوئے۔ معشوق سے کوئی نہیں کہتا کہ وہ دلربا کیوں ہوا۔ سعدی نے یہ حالت خوب نظم کردی ہے :-

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم   باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

اگر بحر مناسب ہوتی تو اس سے بہتر شعر نظم کرنا دشوار تھا۔ خسرو کی جدت پسند طبیعت خود معشوق کو معترض قرار دیکے مناسب بحر میں اور جدید الفاظ میں اس خیال کا اعادہ کرتی ہے۔

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی   ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

عشق مجازی کے واردات بھی بکثرت نظم کئے ہیں :-

تو شبینہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب   کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

محاورات بھی نہایت برجستہ نظم ہوتے ہیں :-

گفتم اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی   عاقبت رفت و ہماں گفتۂ من پیش آمد

انھیں کے ذات سے بکمال فخر وابستہ کرتے ہیں۔ اب ہم تصانیف کی فہرست لکھتے ہیں۔ ایک ضخیم دیوان پانچ حصوں میں ہے (۱) تحفۃ الصغر (۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کا کلام) (۲) وسط الحیات (۲۰ برس کی عمر سے ۲۴ برس کی عمر تک کی شاعری)۔ (۳) غرۃ الکمال (۳۴ برس سے ۴۳ برس تک کا کلام)۔ (۴) بقیۂ نقیہ (غالباً ۷۱۵ھ تک کا کلام) (۵) نہایۃ الکمال (۷۲۵ھ تک کے واقعات کا ذکر ہے اور یہی خسرو کا سنِ وفات ہے)۔ علاوہ اس کے قران السعدین (بغرا و کیقباد کے حال میں۔ سال تصنیف ۶۸۸ھ) مطلع الانوار (تصنیف ۶۹۸ھ بجواب مخزن الاسرار ۳۳۱۰ شعر) شیریں خسرو (تصنیف ۶۹۸ھ ۴۱۲۴ شعر)۔ ہشت بہشت (ہفت پیکر نظامی کا جواب تصنیف ۷۰۱ھ ۳۳۸۲ شعر) یہ پانچوں مثنویاں پنج گنج خسرو کہلاتی ہیں۔ علاوہ بریں تاج الفتوح (تصنیف ۶۹۰ھ جلال الدین خلجی کے حال میں)۔ نہ سپہر (تصنیف ۷۱۸ھ قطب الدین خلجی کے نام پر)۔ دول رانی و خضر خاں (دونوں کے عشق کا قصہ تصنیف ۷۱۵ھ اس میں ۴۲ شعر خود خضر خاں کے ہیں)۔ تغلق نامہ (غیاث الدین تغلق کے حالات میں)۔ افضل الفوائد (خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات)۔ اعجاز خسروی (صنائع و بدائع میں)۔ اور دولت شاہ نے دو اور کتابیں ذکر کی ہیں (۱) مناقب ہند اور (۲) تاریخ دہلی۔ انکے علاوہ ہزاروں اشعار برج بھاشا میں کہے جو نایاب ہیں اور عربی اشعار و عبارات بھی نہایت قابل قدر ہیں۔ پھر فن حساب و موسیقی پر بھی کتابیں لکھنے کا پتہ چلتا ہے۔ واقعی جامع ہو تو ایسا ہو۔

حسن دہلوی

حسن دہلوی۔ نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر خسرو کو پسند آ گئے اور بیحد دوستی ہو گئی اور دونوں یکجان دو قالب معلوم ہونے لگے۔ سلطان محمد قاآن

غرابے کز دہن انداخت دوش آن بیضہا زر   ربودش از قضا ناگہ عقاب آتشیں پیکر
(رات) (تارے) (آفتاب)

اسی طرح زہدیات میں کہتا ہے :۔

زریں نقاب شاہد پیروزہ پیرہن   برداشت تار زلف سیاہ از رخ سمن
بے مہر شاہد یکہ روان شد بہ گرد خاک   شمشیر تیز در کف و بر فرق سر فگن
گر صادقی تو عشوۂ ایں قرص خور مخور   در ہر درہ روی دم ایں ن وگر مزن

خور کے لئے مخور اور زن کے لئے مزن محض لفاظی ہے۔ یہ مذاق نہ کبھی مقبول ہوا۔ نہ ہو سکتا ہے۔ بعضے شعر بالکل چیستان ہیں مثلاً :۔

برگیر یکے را بہ دو در چار و یکے کن   کز نہ نودش جانب دو چل گذر افتد[۱]

۱؎ معنی یہ ہیں کہ مے کو جام میں ڈال تاکہ پانچوں انگلیاں دونوں لبوں تک پہونچیں۔ حل یوں ہو سکتا ہے کہ لفظ "یکے" کے عدد (۴۰) ہیں اور حرف "م" کے عدد بھی (۴۰) ہیں لہٰذا "یکے" سے مراد حرف "م" ہے۔ اسی طرح لفظ "دو" کے عدد (۱۰) ہیں اور حرف "ی" کے عدد بھی (۱۰) ہیں لہٰذا "دو" سے مراد ہے حرف "ی" (یکے + دو = م + ی = مے) لہٰذا "یکے را بہ دو" کے معنی ہیں "مے"۔ دوسرے جزو کا حل یہ ہے کہ چار (۴) عدد ہیں لفظ "جا" کے اور "یکے" سے مراد ہے حرف "م" حسب صراحت بالا۔ لہٰذا "چار و یکے" سے مراد ہے "جام" اور "در چار و یکے کن" کے معنی ہیں "در جام کن"۔ دوسرا مصرعہ یوں حل ہوگا کہ لفظ "نہ" کے عدد ہیں (۵۵) اور لفظ "پنج" کے عدد بھی (۵۵) ہیں لہٰذا "نہ" سے مراد ہے "پنج" اور لفظ "نود" کے عدد ہیں (۶۰) اور لفظ "پنجہ" کے عدد بھی (۶۰) ہیں لہٰذا "نود" سے مراد "پنجہ" ہے اور "پنجہ" کے معنی ہیں پچاس جو حرف "ن" کے عدد ہیں لہٰذا "نود" سے مراد حرف "ن" ہے جس کا تلفظ "نون" ہے اور نون عربی میں مچھلی کو کہتے ہیں جو انگلی سے مشابہ ہے لہٰذا "نود" سے مراد انگلی ہے اور "نہ نود" سے مراد پانچ انگلیاں۔ لفظ "لب" میں "ل" کے عدد (۳۰) ہیں اور "ب" کے (۲) اور لفظ "دو" کے عدد (۱۰) ہیں لہٰذا "ب" قائم مقام (۱۰) کے ہے لہٰذا "لب" قائم مقام (۴۰) کے یعنی چہل یا چل لہٰذا "دو چل" سے مراد "دو لب" ہے۔ فتدبر۔

ملاحظہ ہو:۔

غالت خلیل وچہرہ گلستانِ آتش است　　خطت سیاہئے کہ بداماں آتش است

پیش رخ تو دیدہ سپہری بہم نزد　　آتش پرست ہیں کہ چہ حیرانِ آتش است

بابر بادشاہ

بابر نے سلطنت مغلیہ (تیموریہ ہند) کا بنیادی پتھر ہندوستان میں رکھا اور شعر وشاعری کا مذاق ساتھ لایا۔ علاوہ بابرنامہ کے جو ترکی میں لکھا تھا بعض اشعار بھی مشہور ہیں۔ ایک شعر یاد ہے:۔

نوروز ونوبہار ومی ودلبرے خوش است　　بابر بعیش کوش کہ دنیا دوبارہ نیست

ہمایوں

ہمایوں کی مصیبت کی داستان صفحات تاریخ کو آجتک حسرت ناک بنائے ہے۔ جب شیر شاہ سے شکست کھا کے بھاگا تو شاہ طہماسپ صفوی کو یہ شعر لکھ کے بھیجے:۔

خسرواعمر نیست تا عنقائے عالی ہمتم　　قُلّۂ قافِ قناعت را نشیمن کردہ است

روزگار سفلہ گندم نمائے جو فروش　　طوطیٔ طبع مرا قانع بارزن کردہ است

دشمنم شیر است وعمرے پشت بر من کردہ بود　　حالیا از روے خصمی روے بر من کردہ است

دارم از شہ التماس اکنوں کہ تا با من کند　　انچہ با سلمان[1] علی در دشت ارزن کردہ است

ایک رباعی اور یاد ہے جو اسی شاہ طہماسپ کو لکھی تھی:۔

گشتیم بجاں بندۂ اولادِ علیؑ　　ہستیم ہمیشہ شاد با یادِ علیؑ

چوں سرِّ ولایت از علیؑ ظاہر شد　　کردیم ہمیشہ وردِ خود نادِ علیؑ[2]

---

[1] مشہور ہے کہ سلمان فارسیؓ پر دشت ارزن میں ایک شیر نے حملہ کیا تھا اور امیر المؤمنین علیہ السلام نے انکو بچایا تھا اور شیر کو قتل کیا تھا صفویہ چونکہ سادات تھے اور ہمایوں تاتاری تھا لہذا یہ التماس نہایت پرلطف ہے۔

[2] لفظی معنی ہیں پکار علیؑ کو، کتب معتبرہ میں ہے کہ رسول مقبولؐ کو حکم الٰہی ایک جنگ میں پہونچا تھا کہ علیؑ کو مدد کے لئے پکارو اور الفاظ روایت یہ ہیں نادِ علیاً مظہر العجائب تجدہ عونا لک فی النوائب کل ہم وغم سینجلی بولایتک یا علی یا علی یا علیؑ۔ ارباب عقیدہ اسکو مصیبت میں پڑھتے ہیں اور خدا سے کشائش طلب کرتے ہیں۔

علیہ السلام کی تعریف اس وقت یاد ہے جس سے قوت شاعری کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے :۔

شہے کہ بگذرد از نہ سپہر افسر او　　　اگر غلام علیؑ نیست خاک بر سر او

عبدالرحیم خانخاناں

رحیمی عبدالرحیم خانخاناں کا تخلص تھا جس کا دور بیرم خاں کی معزولی کے بعد شروع ہوا۔ یہ شاعری سے مناسبت فطری لئے آیا تھا اور قدر دانی اہل کمال میں سلاطین وقت سے بڑھا ہوا تھا۔ بہار تر کمالوں کا یادگار ہندوستان میں آکے ممدوح[1] شعرا اور محسود امرا ہو جائے تفضل خدا نہیں تو کیا ہے۔ احمد آباد میں ایک عظیم الشان کتبخانہ اور لٹریچر میں بیش بہا اضافے آجتک یادگار ہیں۔ چند منتخب اشعار غزلوں کے لکھے جاتے ہیں۔ دیکھو کلام میں کتنا مزا ہے :۔

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست　　　تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

غمت مباد اچہ می پرسی از حکایت من　　　دل تو طاقت ایں گفتگو کجا دارد

"غمت مباد" اخدا تجھے کوئی غم نہ دے! کتنی محبت بھری دعا ہے! اس کی لذت اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں۔ ایک اور تصویر دیکھو۔ معشوق کی نظر تڑپتے ہوئے عاشق پر پڑ جانا مآل زندگی ہے بلکہ کل محنتیں سوارت ہیں :۔

بہائے خون من وصد ہزار ہمچو من است　　　کہ من بخون طپیم و قاتلم نظارہ کند

اور "صد ہزار ہمچو من است" کا لطف تو بیان ہی نہیں ہو سکتا۔
اللہ رے محبوب کی عظمت اور شان بے نیازی!

حکیم ابو الفتح

حکیم ابو الفتح گیلانی (المتوفی ۹۹۷ھ) بھی خانخاناں کی طرح شعرا کا گروہ قائم کئے ہوئے تھا اور علما و فضلا کی تربیت میں مصروف تھا۔ عرفی اور حیاتی گویا اسی کے ساختہ و پرداختہ تھے اور جدید رنگ جو ہندوستان میں فارسی شعرا

---

[1] از مجمع الفصحا۔

فیضی

فیضی فیاضی یمنی الاصل تھا۔ اسکے دادا ناگور میں آئے اور ایک عربی النسل خاندان میں شادی کی جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے۔ **فیضی** ان کا بڑا بیٹا ہے (ولادت ۹۵۴ھ) باپ خود صاحب کمال تھے اور چار جلدیں تفسیر قرآن کی تفسیر کبیر کے اندازہ پر لکھی تھیں جس کا نام منبع العیون ہے۔ بیٹا بھی کمالات میں باپ سے کم نہ نکلا اور علوم متداولہ میں دستگاہ کامل پیدا کی۔ فن شعر بظاہر خواجہ حسین مروی[۱] سے سیکھا تھا۔ ابتدائی زمانہ اپنے والد اور دونوں بھائیوں ابوالفضل اور ابوالخیر کے ساتھ نہایت صعوبت میں گذرا۔ ان لوگوں پر کبھی مہدوی ہونے کا الزام تھا کبھی شیعہ ہونے کا۔ عبدالنبی اور مخدوم الملک اپنے تعصب مذہبی کی وجہ سے انھیں بیحد ستاتے رہے آخر شیخ مبارک کا کمال باثر ہوا اور چند امراے دولت اس خاندان[۲] کے طرفدار ہو گئے۔ بادشاہ سے سفارش کی اور ۹۷۴ھ میں بڑے احترام سے شیخ مبارک اور ابوالفضل[؟] حاضر دربار ہوئے اور رفتہ رفتہ اتنا شوخ ہو گیا کہ دونوں متعصب دشمنوں کو پست کر دیا۔ **فیضی** کو طبابت اور شاعری کا شوق تھا اور علمی مشاغل کی وجہ سے کوئی سرکاری کام لینا نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی بچ نہ سکا۔ شہزادہ دانیال کا معلم ہوا۔ پھر آگرہ۔ کالنجر اور کالپی کا صدر رہا۔ ۹۹۶ھ میں ملک الشعرا کا خطاب پایا۔ عجب اتفاق تھا کہ خطاب ملنے سے دو چار دن پیشتر کہہ چکا تھا:۔

آں روز کہ فیض عام کردند	ما را ملک الکلام کردند
از بہر حصول فکر بستان	آرائشِ ہفت بام کردند
مارا بہ تمام در ربودند	تا کار سخن تمام کردند

۱۔ علاء الدین سمنانی کے خاندان سے تھے۔ معقولات مولانا عصام سے اور منقولات علامہ ابن حجر مکی سے پڑھے تھے۔ اکبر کے حکم سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ نظم کرنا شروع کیا تھا۔ ۱۰۰۰ھ میں انتقال ہو گیا۔ ۲۔ تفصیل کے لئے شعر العجم جلد سوم دیکھو۔

غرض یہ صاحب کمال ضیق النفس میں مبتلا ہوا جیسا کہ خود کہتا ہے :-

دیدی کہ فلک بمن چہ نیرنگی کرد — مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد

آں سینہ کہ عالمے درو می گنجید — تا نیم نفس بر آورم تنگی کرد

بیماری روزانہ بڑھنے لگی اور فیضی کو زندگی سے مایوسی ہو گئی۔ کہا کرتا تھا :-

گر ہمہ عالم بہم آید بتنگ — نہ شود پائے یکے مور لنگ

آخر صفر ۱۰۰۴ھ میں انتقال کر گیا۔ تخلص اس کا فیضی بھی تھا اور فیاضی بھی چنانچہ خود کہہ گیا ہے :-

زیں پیش کہ سکہ ام سخن بود — فیضی رقم نگیں من بود

اکنوں کہ شدم بعشق مرتاض — فیاضی ام از محیط فیاض

فیضی ایک عالم آدمی تھا اور عالمانہ زندگی بھی بسر کرتا تھا۔ عبد القادر بدایونی کو اس سے بیحد عداوت تھی مگر فضل و کمال کا قائل تھا۔ لکھتا ہے کہ فیضی

”در فنون جزئیہ از شعر و معما و غرض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا عدیل در روزگار نداشت“

نثر میں سادہ نویسی مرغوب تھی اور مطالب کو تکلفات و تصنیفات کے پھندے میں نہیں پھنساتا تھا۔ نظم میں قوت خداداد تھی خصوصاً غزلیں اور مثنویاں لاجواب تصنیف کی ہیں نل دمن کے بارے میں بدایونی کی رائے باوجود مخالفت و عصبیت کے یہ ہے :-

”الحق مثنوی است کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر نگفتہ باشد“

اور فلسفہ کا مجموعہ ہے اور زورِ کلام نلدمن سے زائد۔ مثلاً منزلِ تسلیم میں آکے شکوہ و شکایت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور مصائب یہ سمجھ کے جھیلے جاتے ہیں کہ ہماری ترقیِ مدارج انھیں امتحانات پر منحصر ہے مصیبت اور زحمت وہ آگ ہے جو نفسِ انسانی کو تپا کے طلائے خالص بنا دے گی۔ یہ مصائب خود خدائے پاک نے ہمارے امتحان کے لئے نازل کئے ہیں۔ یہ مصیبت نہیں بلکہ عینِ رحمت ہے۔ دیکھو کس شان سے کہتا ہے :۔

روئے کشادہ باید و پیشانیِ فراخ — آنجا کہ لطمہائے ید اللہ میزنند
خدا کے ہاتھ کے طمانچے ۱۲

ایک اور غزل میں کہتا ہے :۔

عشق تا پائے بیفشرد در اندیشۂ ما — ہمہ معشوق ترا دو زرگ و ریشۂ ما
از تفِ بادۂ ما بال ملائک بگداخت — وائے آں روز کہ رقصے جہد از شیشۂ ما

دیکھو روزِ الست کی کیفیت کا انجام کار سے کتنا نفیس تقابل ہے شکوہ نظم اور سلاست زبان اتنے نازک مسائل کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے کہ شاید دوسری حیثیت میں عالم ہی بدل جائے۔ "ہمہ اوست" کا رنگ ملاحظہ ہو :۔

عجب ترانۂ دلِ فیضی ندیدہ ایم طلسم — کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص

مصائبِ عشق کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ یہ درد خود مصیبت خیز ہے اور اسی کے توسط سے جو بلائیں آتی ہیں وہ بھی عاشق پر مؤثر ہوتی ہیں اور دوسری زحمتوں سے انکا تعلق مٹ جاتا ہے لہذا عاشقِ صادق کا اُدھر خیال ہی نہ جانا چاہئے :۔

درد دشت آرزو نبود بہیم دام و دد — راہے است ایں کہ ہم زتو خیزد بلائے تو

بارِ امانت اٹھانے کا تہیہ کرتا ہے تو خود عشق سے مدد کا جویا ہوتا ہے اور اُسی کی برکات روحانی اور اجازت سے فیض پاتا ہے :۔

اے عشق اجازت است کہ از دوشِ آسماں — بر دوشِ خود نہم علمِ کبریائے تو
اجازت ۱۲

عرفی

عرفی جمال الدین سید محمد بن زین الدین علوی۔ شیراز سے سید ھا **فیضی** کے پاس آیا اور رہنے سہنے لگا۔ پھر کچھ ناراض ہوگیا اور **حکیم ابوالفتح گیلانی** سے دوستی پیدا کی اور علمی مباحثات کا یہ اثر ہوا کہ خوش گوئی اور خوش فکری میں روز بروز ترقی کرنے لگا۔ **ابوالفتح** کے انتقال کے بعد **خانخانان** کی صحبت میں داخل ہوا اور بڑے بڑے انعام حاصل کئے مگر طبیعت میں خودداری اس قدر تھی کہ بیجا خوشامد اور چاپلوسی سے کراہت کرتا تھا۔ صاحب **مآثر رحیمی** لکھتے ہیں کہ "ہندوستان کے درباروں میں تسلیم و کورنش وغیرہ کا طریقہ جاری ہے اور ہر شخص پر اُس کی پابندی لازم ہے مگر عرفی نے کبھی اس کا خیال نہ کیا۔ جس طرح جی چاہا محفل امرا میں گیا اور سب نے اُس کی خاطر کی"۔ شہزادہ **سلیم** سے بیحد محبت تھی مگر جب کوئی قصیدہ اُسکی بلکہ **اکبر** کی تعریف میں نظم کیا تو اپنی تعریف کے اشعار بھی شامل کردئے تاکہ فی الجملہ مساوات قائم رہے۔ اگر کبھی کچھ **ابوالفتح** یا **خانخاناں** سے طلب کیا تو یہ کہہ کے کہ صلہ دوستی طلب کرتا ہوں نہ کہ صلہ شعر۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے ان دو ممدوحوں کے پانچ قصائد جہانگیر و اکبر کی تعریف میں نظم کئے ہیں یا بزرگان دین کی تعریف میں۔ جہانگیر سے محبت کا شہرہ اس قدر ہوا کہ ۹۹۹ھ میں حاسدوں نے زہر دیکے اس کی زندگی کا خاتمہ کردیا اور زیادہ سے زیادہ ۳۶ برس کی عمر پاکے لاہور میں پیوند خاک ہوگیا۔ چند روز بعد ایک فقیر قبرستان میں آکے اسکی ہڈیاں اپنے بھائی کے دھوکے میں نکال لے گیا اور نجف میں دفن کردیا۔ عرفی نے ایک قصیدے میں امیر المومنین علیہ السلام سے عرض کیا تھا:۔

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم   اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

عجب اتفاق ہے کہ ہند میں انتقال ہوا اور قبر سے ہڈیاں نکل کے نجف گئیں۔ اسی خلوص او رحسن اعتقاد پر نظر رکھ کے مُلّا رونقی ہمدانی نے اس واقعے کی تاریخ نظم کی جس میں اس شعر کی طرف بھی اشارہ ہے:۔

جو ابوالفضل کو مطلوب ہے۔ اور بعض مخالفین کے خیال کے موافق "استعارۂ خنک" کا عیب بھی باقی رہ گیا ہو لیکن ذوقِ فطری اور قوتِ خداداد نے جو معراج اس دور کے شعرا میں اسکے کلام کو دی ہے شاید دوسرے کو نصیب نہ ہو سکی۔ استعارات و تشبیہات جدید بکثرت پیدا کئے جن سے زبان کو وسعت ہوئی اور اسکے مخصوص فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے کے قابل ہوئی۔ مثلاً ایک قصیدۂ نعتیہ میں نعمتوں کو خضر کہدیا ہے۔ یہ تشبیہہ "خنک" سمجھی گئی ہے اور ہو بھی سکتی ہے کیونکہ وجہ شبہ لطافت کے لئے بظاہر کافی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلعم سے مخاطب ہو کے کہتا ہے :۔

من ہم بخجالت لبِ تجلت نکشایم   اے آب حیات ازلبِ تو خضر نعم را

حالت یہ ہے کہ عرفی کو گناہ بخشوانا ہیں اور گناہ "ہلاکت معنوی" ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کی برکت سے حیات ابدی ملجائے مگر گناہوں کی زیادتی دیکھ کے ایسا شرمندہ ہوتا ہے کہ براہ راست درخواست بھی نہیں کر سکتا۔ مجبوراً فقیر کا بھیس بدل کے صدا لگاتا ہے کہ اے ممدوح تیری بارگاہ ایسی جاں بخش ہے کہ نعمتہائے ہدایت و رسالت بھی حیات ابدی حاصل کرنے کے لئے تیرے لبوں تک آئی ہیں اور یہ ادعا صحیح بھی ہے کیونکہ آپ خاتم الانبیا تھے اور آپکی شریعت ابدالآباد تک رہنے والی ہے۔ اب اس سے بہتر تشبیہ کیا ہو سکتی ہے کہ خضر نے باوجود قوتِ نبوت و ہدایت آب حیات کو پیا اور حیاتِ جاوید حاصل کی مگر شریعت کو حیاتِ جاوید وہاں بھی نہ ملی۔ یہ اسوقت نصیب ہوئی جب تیرے لبوں سے احکام الٰہی جاری ہوئے۔ لہذا ان نعمتوں کو اس زمانے کا خضر کہنا چاہیئے۔ اب عرفی یہ صدا لگا کے خاموش ہو جاتا ہے۔ کریم خود سمجھ سکتا ہے کہ سائل حیاتِ ابدی مانگتا ہے اگرچہ ہلاکت معنوی میں گرفتار ہے۔ ممکن ہے کہ لبوں کو

وحاشیۂ الفاظ و سرعت فکر و دقّتِ نظر کسے را چوں او ندیدہ و نشنیدہ"۔ بعض تشبیہیں خاص طور سے ایک مضمون پر مسلسل نظم ہوی ہیں اور اُن میں حقائق و معارف کے دریا بہادئے ہیں۔ مثلاً یہ مسئلہ نظم کرتا ہے کہ مسرتِ خدا داد جب آتی ہے تو امیر و غریب سب کے لئے یکساں ہوتی ہے بلکہ شاید صاحبِ عسرت کو زیادہ حظ آتا ہے۔ تمثیل واقعاتِ عالم میں ڈھونڈھتا ہے اور "عید" کا دن اس خیال کے ادا کرنے کے لئے موزوں نظر آتا ہے۔ شب عید بادشاہ اپنے بستر مکلّف و نرم پر سوتا ہے اور فقیر اپنے ہاتھ تکیہ کی جگہ رکھے ہوے فرشِ خاک پر یا کنکروں پر گہری نیند سوتا ہے اور دونوں اپنے بستر کو "تکیہ گاہ ناز و نعیم" پاتے ہیں۔ صبح اٹھ کے بادشاہ بھی آرائش و زیبایش کرتا ہے اور فقیر بھی ذرا اپنی ٹوپی جھاڑ کے ترچھی پہن لیتا ہے اور دونوں اپنے اپنے حال میں مطمئن اور مسرور نظر آتے ہیں۔ دیکھو کس لطف سے یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ کہتا ہے :۔

صباحِ عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم　　　گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

اسی طرح اور قصائد بھی مسلسل نظم کئے ہیں اور بڑے بڑے دقیق مسائل حل کئے ہیں۔ یہ طرز اد امقبول بھی ہوئی اور مطلوب بھی۔ عبد الباقی اس کے معاصر کی رائے ہے :۔

"مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال در میانہ مستعدان و اہل زمان معروف است و سخن سنجان تتبع او می نمایند"

زورِ تخیل اسے نئے نئے محاورے ایجاد کرنے پر مجبور کرتا ہے کبھی "یوسف زار" کہتا ہے کبھی "نشتر خیز"۔ کہیں "حسن آباد" نظم کرتا ہے۔ کہیں "رمز فروش"۔ مجبور ہے کیا کرے اور کیونکر قوت کلام میں پیدا کر کے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ استعارے، تشبیہیں، بندشیں عجیب اور غیر مانوس بھی ہو جاتی ہیں مگر شیرینی کلام

کے رنگ سے کتنا بلند ہو گیا ہے:۔

یارب تونگہ دار دلِ خلوتیان را — کان مغبچہ مست ودرِ صومعہ باز است

چو برد پیام قاصد کنم ایں خیال وگریم — کہ بہ پیش حکایت من؟ یکجا رسیدہ باشد

آں چناں مستِ جمال است کہ شب تا بسحر — می کشد جام و زکیفیت مے آگہ نیست

حقائقِ معرفت میں تو وہ امتیازی جگہ حاصل کرلی ہے کہ ہمعصروں میں نظر ہی نہیں آتی۔ چند اشعار اس رنگ کے بھی سنو:۔

دو عالم سوختن نیز نگِ عشق است — شہادت ابتدائے جنگِ عشق است

دماغِ آشفتۂ داریم دل نام — کہ سرتاپائے صلح وجنگِ عشق است

اے اجل اجاں ندہند اہلِ وفا سعی مکن — یا برو رخصت آں غمزۂ خونخوار بیار

تا چند بزنجیرِ خرد بند تواں بود — بے مستی و آشوب جنوں چند تواں بود

طغیان نازبیں کہ جگر گوشۂ خلیل — در زیر تیغ رفت وشہیدش نمی کنند

حقائق کا علم نہ ہونا اہلِ تصوف کے یہاں کا مشہور مضمون ہے اور ہر شخص نے اپنے اپنے رنگ میں یہ مشکل پیش کی ہے۔ عرفی کی طرز ادا دیکھو:۔

حدِ کنہ تو بہ ادراک نشاید دانست — وین سخن نیز باندازۂ ادراکِ من است

حق الحقائق تک فلسفہ و منطق نہیں پہونچا سکتے اور نہ رسم پرستی اُن حدود کے نزدیک جاتی ہے۔ ہاں! عارف کا دل کچھ دیکھتا ہے:۔

فقیہاں دفترے را می پرستند — حرم جویاں درے را می پرستند

برافگن پردہ تا معلوم گردد — کہ یاراں دیگرے را می پرستند

ساکنِ کعبہ کجا دولت دیدار کجا — اینقدر ہست کہ در سایۂ دیوارے ہست

مدہ عنانِ تعلق بدست ہر ذرہ — بیا بہ دستے و بردوشِ آفتاب انداز

قدوۂ نظم غزالی کہ سخن　　　ہمہ از طبع خداداد نوشت
عقل تاریخ وفاتش بد وطور　　　سنۂ نہصد و ہشتاد نوشت

ابوالفضل کی رائے ہے کہ "بہ بلند فہمی و شیوا بیانی طراز یکتائی داشت و از دلآویز گفتار صوفیہ بہرہ مند" - ایک شعر اس وقت یاد ہے جس میں دنیا کی چند روزہ زندگی کی بے مثل تمثیل دی ہے :-

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم　　　دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

ایک رباعی بھی معرفت میں درج کی جاتی ہے :-

سلطان گوید کہ نقد گنجینۂ من　　　صوفی گوید کہ دلق پشمینۂ من
عاشق گوید کہ داغ دیرینۂ من　　　من دانم و دل کہ چیست در سینۂ من

غزالی کی مایہ ناز تصنیف مثنوی نقش بدیع ہے جس کے انتخاب کے بغیر یہ تذکرہ بالکل ناقص رہیگا - چند شعر ملاحظہ ہوں :-

خاک دل آں روز کہ می بیختند　　　شبنمے از عشق بر آں ریختند
دل کہ بداں رشحہ غم اندود شد　　　بود کبابے کہ نمک سود شد
دیدۂ عاشق کہ دہد خون ناب　　　ہست ہماں خوں کہ چکد از کباب
بے اثر مہر چہ آب و چہ گل　　　بے نمک عشق چہ سنگ و چہ دل
دل کہ ز عشق آتش سودا در اوست　　　قطرۂ خونیست کہ دریا در اوست

دو شعر اسکے اور یاد آگئے - ملاحظہ ہوں :-

بستر شدہ در کوئے تو خاکستر م امشب　　　یا سوختہ از آتش دل بستر م امشب
جاں دادم و فارغ شدم از محنت ہجراں　　　یعنی کہ ز شبہائے دگر بہتر م امشب

ایک مثنوی اسرار المکتوم بھی غزالی کی تصنیف سے ہے اور اچھی ہے -

حرفی　　حرفی اصفہانی - اصفہان کا رہنے والا ہندوستان میں آگیا -

ابوالفضل

ابوالفضل علامی تخلص۔ شیخ مبارک ناگوری کے دوسرے بیٹے تھے اور فیضی کے چھوٹے بھائی۔ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے اور درسیات ختم کرنے کے بعد باپ اور بھائی کے ساتھ مصائب میں گرفتار رہے۔ جب خاندان کا ستارۂ اقبال چمکا تو یہ بھی اکبر کے دربار میں پہنچے اور رفتہ رفتہ کل ممالک محروسہ کے وزیر ہو گئے۔ شہزادہ سلیم (جہانگیر) کو آخر میں شدید عداوت ہو گئی اور یہ دکن کی مہم سے واپس ہو رہے تھے کہ جہانگیر کے ایما سے نرسنگھ دیو نے راہ میں قتل کر ڈالا۔ یہ واقعہ غالباً ۱۰۱۱ھ میں واقع ہوا۔ اکبر کو بے حد صدمہ ہوا اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ بھی انتقال کر گیا۔

تصانیف علامی میں اکبر نامہ۔ آئین اکبری اور انشائے ابوالفضل مشہور ہیں۔ **اکبر نامہ** تاریخ ہے اور طویل فقروں اور جملوں میں لکھی گئی ہے۔ **انشائے ابوالفضل** خطوط اور تقریظوں کا مجموعہ ہے۔ جملے اتنے طویل ہیں کہ بعض وقت ایک ایک صفحہ کے بعد جملہ ختم ہوتا ہے۔ عربی الفاظ کی بھرمار ہے۔ مرادفات و مکررات کی کوئی حد نہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ مذاق عصر کے موافق لکھی گئی ہے۔ **آئین اکبری** کی عبارت نادر الوجود ہے۔ مضامین کے اعتبار سے تو تینوں کتابیں اکبر کی ملک گیری۔ نظام سلطنت۔ دول خارجہ سے تعلقات۔ اخلاقی اور مذہبی حالات۔ درباریوں کے تراجم۔ غرض تمام تفاصیل پر حاوی ہیں۔ طرز تحریر میں البتہ ہر ایک کتاب سے جدا ہے۔ استواری تراکیب۔ کوامت الفاظ۔ شیرینی اور فصاحت سب کا لحاظ کیا گیا ہے بلکہ خالص فارسی کے محاورات اور الفاظ کثرت داخل کئے ہیں۔ اکثر جدید اصطلاحیں بھی بنائی پڑی ہیں۔ اگر اس زمانے میں یہ رنگ مقبول ہو جاتا تو آج زبان کے صاف کرنے کی اولیت ناصر الدین شاہ اور قاآنی وغیرہ کو نہ ملتی۔ زمانے کی بد مذاقی نے پھر وہی ڈھرا

تھا۔اس کے کلام کا انتخاب بھی جہانگیر نے کیا ہے جس کے متعلق مولانا شبلی کی رائے ہے کہ شاید طالب اس سے اچھا انتخاب خود نکر سکتا۔ایک مرتبہ خانخاناں نے جامی کی مشہور طرح "ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید" پر غزل کہی۔مراد صفوی اور شہزادہ مراد نے بھی غزلیں نظم کیں۔جہانگیر نے مصرعہ لگا کے فی البدیہہ یہ مطلع کہا:۔

ساغر مے بر رخ گلزار می باید کشید ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

پھر جامی کی غزل نکلوائی تو سوائے اس مصرع کے کوئی پسند نہ آیا۔خود **تزک جہانگیری** میں لکھتا ہے:۔

"ایں مصرع ظاہر شد کہ از مولانا عبدالرحمٰن جامی است۔غزلِ او تمام بنظر درآمد۔غیر ازاں مصرع کہ بطریق مثل زبان زد روزگار شدہ دیگر کارے نساختہ۔بغایت سادہ وہموار گفتہ۔"

ایک اور واقعہ لکھتا ہے:۔

"بتقریبے ایں بیت امیرالامراء خواندہ شد ع بگذر مسیح از سر ما کشتگانِ عشق، یک زندہ کردنِ تو بصد خوں برابر است۔چوں طبع من موزون است گاہے بہ اختیار و گاہے بے اختیار مصراعے ورباعی یا بیتے در خاطرم سرمی زند۔ایں بیت بزبان گذشت:۔

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس،
یک دل شکستنِ تو بصد خوں برابر است

چوں خواندہ شد ہر کس کہ طبع نظمے داشت دریں زمین بیتے گفتہ گذرانید۔ملا علی احمد مہرکن کا حال او پیش ازیں گذشت بد نگفتہ بود:۔

اے محتسب ز گریہ پیر مغاں بترس یک خم شکستنِ تو بصد خوں برابر است"

ان اقتباسات سے جہانگیر کے مذاق نظم ونثر کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔خصوصاً

اورنگ زیب

اورنگ زیب تو خود ہی عالم جید اور منشی بے بدل تھا۔ **رقعات عالمگیری** اسکے خطوط کے ایک چھوٹے سے مجموعے کا نام ہے جو مذاق رائج الوقت کا اصلاحی پتھر نصب کرتا ہے۔ رنگ تحریر ابوالفضل کے مکاتیب سے ملتا جلتا ہے مگر پیچدار استعاروں اور طویل جملوں سے بالکل پاک ہے اور سلاست و روانی میں کلام الملوک ملوک الکلام کا بہترین نمونہ ہے۔ فن شعر کا چراغ بقول علامہ شبلی اس کے زہد خشک نے ضرور گل کر دیا تھا۔

زیب النسا

زیب النسا بیگم مخفی ستارۂ خاندان مغلیہ کی شعر گوئی اور سخن سنجی کے افسانے آجتک مشہور ہیں اور ایک دیوان شعر یادگار ہے اگرچہ نسخۂ متداول میں مخفی رشتی وغیرہ کے اشعار بھی شامل ہیں۔

داراشکوہ

داراشکوہ کا نام سلاطین کی فہرست سے اورنگ زیب نے محو کر دیا مگر زمرۂ مصنفین میں ابتک چمک رہا ہے۔ یہ آزاد منش اور صوفی مشرب شاہزادہ اکبر شاہ کے دوش بدوش چلنے کو تیار تھا مگر اقبال نے یاوری نہ کی۔ البتہ اسکی تصانیف کو لٹریچر نے امتیازی جگہ دے دی ہے۔

ظفر خاں اور ابراہیم عادلشاہ

ظفر خاں والئی کشمیر اور **ابراہیم عادل شاہ** والئی بیجاپور کے نام بھی سخنگویوں اور سخن سنجیوں میں پیش پیش ہیں اور صائب و ظہوری وغیرہ انھیں درباروں کے پروردہ یافتہ ہیں۔

افسوس ہے کہ کتاب طویل ہوتی جاتی ہے اور لکھنا بہت ہے لیکن بعض کاملین کے حالات اختصار کے ساتھ لکھ کے یہ باب ختم کیا جاتا ہے۔ ارادہ ہے کہ ایک مستقل جلد دورۂ ہندیہ کی تحقیق کے ساتھ تالیف کیجائے۔ انشاءاللہ اسوقت کچھ حق سخن سنجی ان لوگوں کا ادا ہو سکے گا۔

نظیری

ارباب کمال میں سب سے پہلے نظیری کا نام لینا چاہیے۔ محمد حسین نام نیشاپور

ہمیشہ رکھا ہے کیونکہ غزل کے معنی ہیں "حکایت از معشوق" یعنے معشوق سے باتیں کرنا یا معشوق کے متعلق باتیں کرنا۔ اس نکتہ پر لحاظ کرکے نظیری چاہے عرفی کے رنگ میں فلسفہ گوئی کرے چاہے صائب کی طرح تمثیلات نظم کرے۔ حقیقت کے عالم میں ہو خواہ دنیائے مجاز کے نظارے کرہا ہو سلاست زبان اور شیرینیٔ ادا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ اسکا خیال ہے کہ غزل کا عنصر خاص "تغزل" ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں۔ تصوف کا رنگ دیکھو:۔

تو پندار کہ ایں قصہ زخود می گویم — گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

عالم مجاز کی حسن تخییل پر نظر کرو:۔

نیست لذّت ز نظر بازیٔ بزمے کو درو — خندۂ زیر لب و گریۂ پنہانی نیست

تمثیلی شاعری کا اندازہ کرو:۔

شکوہ نقصان داشت فصلے از میاں انداختم

نرخ ارزاں بود کالا در دکاں انداختم

آں وہد در گریہ پندِ ما کہ با ما دشمن است

ہر کہ می گیرد شناور را بہ دریا دشمن است

معاملات عشق یوں کہے ہیں:۔

ایں دل کہ در وصال تسلّی از وجود — خرسندش از تغافل و دشنام کردہ ایم

فلسفیت کا انداز:۔

خضر صد منزل بہ پیشم آمد و نشناختم — باز میباید ز سر گیرم رہ پیمودہ را

ایک مسلسل غزل سنو اور اندازہ کرو کہ معاملات حسن و عشق میں اس کی نظر کہاں تک گئی ہے:۔

چشمش براہِ مہر و مژگاں تمنا کش نگر

نظیری: درسینہ دارد آتشے پیراہن چاکش نگر

لالہ در گلشن سیہ مست است و نرگس در خمار

تا بہ کے از مے تہی بینم ایاغِ خویش را

گر ترا تکلیف مے خوردن کنم عیبم مکن

باغباں از آب دارد تازہ باغِ خویش را

۱۰۳۰ھ کے بعد اسکی وفات ہوئی اور کشمیر میں دفن ہوا۔

صائب

صائب مرزا محمد علی اصفہانی بعد فراغت حج آخر عہد جہانگیر میں وارد ہندوستان ہوا۔ جب کشمیر پہونچا تو ظفر خاں والئی کشمیر سے ملاقات ہوئی اور بقدر آپس میں لطف بڑھا کہ صائب اسی کا مداح ہو گیا۔ شاہجہاں نے اپنے زمانے میں لشکر خاں کو صوبۂ کشمیر کی ولایت سپرد کی اور ظفر خاں کو دار السلطنت میں طلب کر لیا۔ صائب بھی ساتھ آیا اور سفر دکن میں بھی ظفر خاں اور شاہجہاں کے ہمراہ رہا۔ برہان پور کے زمانۂ اقامت میں صائب کے باپ اصفہان سے آئے اور بیٹے کو وطن لے جانے کے جویا ہوئے۔ میرزا نے اجازت طلب کی مگر اتفاق سے شاہجہاں نے آگرہ کا قصد کر دیا۔ مجبوراً سب کو وہاں جانا پڑا۔ ۱۰۴۲ھ میں ظفر خاں کو پھر کشمیر کی صوبہ داری ملی اور صائب اپنے ممدوح کے ہمراہ واپس گیا۔ وہاں پہونچکے ظفر خاں سے رخصت ہوا اور اصفہان میں سکونت پذیر ہو گیا۔ سلاطین صفویہ نے بھی اسکی قدر دانی کی آخر ۱۰۸۰ھ میں انتقال ہوا اور اصفہان میں مدفون بنا۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ "ایران میں شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور میرزا صائب پر ختم ہو گئی" صرف قاآنی کا استثنا کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ رائے کسی حد تک مبالغہ آمیز ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ غزل گوئی میں ایک طرز خاص کا موجد ہے اور ذکاوت اور ذہانت میں لاجواب۔ ایک مرتبہ یہ مصرعہ پڑھا گیا:-

دویدن۔ رفتن۔ استادن نشستن خفتن و مردن

مذمتِ شراب کے بعد کہتا ہے :-

بگذر ز تاک بدگہر و آب او کہ ہست ۔۔۔ ہر دانہ ریش خونی فرزندِ بوتراب[۱]

اگرچہ یہی تخلیص نظیری کے یہاں بھی ہے :-

ازاں شراب کنی در قدح کہ باد صبا ۔۔۔ ز فیض نکہت او روح داد عیسیٰ را

ہزار کوہ غم از یکدگر فرو ریزد ۔۔۔ در آں مقام کہ ظاہر کند تجلّا را

نزاں شراب کہ انگور او شہید کند ۔۔۔ شہ سریر امامت علیؑ موسیٰ را

طالب آملی

طالب آملی ابتدائے شباب میں ہندوستان چلا آیا اور تلاشِ معاش میں ادھر اُدھر پھرا کیا مگر جب کوئی صورت نہ نکلی تو میرزا غازی خاں[۲] والئی قندھار کے پاس پہونچا اور مقربانِ خاص میں داخل ہوا۔ رفتہ رفتہ خلوص نے اتنی ترقی کی کہ غازی خاں کو بجائے ممدوح کہنے کے معشوق کہنے لگا :-

تکلف نیست معشوق منست او نیست ممدوحم ۔۔۔ ازاں ایں شعر عشق آمیز در مدحش سرائیدم

غازی خان کے بعد پھر ہندوستان آیا اور عبد اللہ فیروز جنگ حاکم گجرات کے نام خواجہ قاسم دیانت خاں کا سفارشی خط لیکے احمدآباد گیا اور بہت عزت حاصل کی پھر اعتماد الدولہ[۳] تک رسائی پیدا کی اور آپکے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ یہانتک کہ دربارِ شاہی میں پیش کیا گیا اور ١٠٢٨ھ میں ملک الشعرائے دربار ہوگیا اور نہایت عزت و احترام سے بسر کرنے لگا آخر ١٠٣٦ھ میں جہانگیر سے ایک سال پیشتر

---

[۱] مشہور ہے کہ مامون رشید نے امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام کو انگور میں زہر دیکے شہید کیا تھا اگرچہ مامون کا قاتل ہونا مختلف فیہ ہے۔ [۲] یہ سخن شناس تھا اور خود بھی وقاری تخلص کرتا تھا اور شعر کہتا تھا۔ رنگِ طبیعت کا اندازہ ان اشعار سے ہوجائیگا :-

در عہد تو مارا ہمہ با غیر خطاب است ۔۔۔ سرپنجۂ مژگاں و گریباں عتاب است

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب ۔۔۔ ابر ہر چند گرید برخ گلشن خندد

غازی خاں کی عمر صرف ٣٥ برس کی تھی کہ ایک غلام کے ہاتھ سے مسموم ہوا۔

[۳] نورجہاں بیگم کا چچا۔

رحلت کی اور غنی کشمیری نے تاریخ کہی۔ "طور معنی بود روشن از کلیم"۔ فن شعر میں کلیم کا کلام ہر صنف میں موجود ہے بلکہ جزئیات پر بھی نظمیں پائی جاتی ہیں مثلاً انگوٹھی۔ قلمدان۔ کشتی۔ بندوق پر اشعار نظم کئے ہیں۔ یہ خصوصیت اسے مذاق حال سے نزدیک لاتی ہے اور ہمعصروں کی نظر میں ہجو بہ روزگار ٹھہراتی ہے۔ مثنویوں میں ہندی الفاظ بکثرت درج لئے ہیں:۔

منہ بر وعدۂ تنبولیاں دل — کہ جز خون خوردن از وی نیست حاصل
ز حسن شستۂ دھوبی چہ گویم — از اں بے پردہ محبوباں چہ گویم

درختوں اور پھولوں کا ذکر کرتا ہے:۔

ز موزہ ناں نظر در یوزہ دارم — کہ وصف مولسری را برنگارم
گل گڑہل نفہمیدست مہ بیم — شگفتہ چوں رخ یارست دائم
نمائم اش از بس خوش نسیم است — دل طوبی ز رشک آں دو نیم است

واقعہ نگاری کا بھی شوق تھا۔ شہزادگی کے زمانے میں عالمگیر کا ایک ہاتھی سے مقابلہ ہوا نہایت صفائی سے یہ واقعہ ایک مثنوی میں تحریر کیا ہے (دیکھو شعر العجم جلد سوم) قصائد میں مشکل بندشوں اور پیچدار ترکیبوں سے احتراز کیا ہے اور مبالغہ و حسن تعلیل کو وسعت دی ہے۔ مولانا شبلی کی رائے ہے کہ "قصیدے کی متانت اور بلندی کم ہو گئی ہے اور غزلیت کا رنگ غالب آ گیا ہے"۔ فی الحقیقت عرفی و فیضی کے بعد سے یہ صنف پست ہو گئی اور زمانے کا مذاق اسے اسی پست مقام پر پہنچا رہا۔ کلیم تشبیہوں میں جب واقعہ نگاری کرتا ہے تو تخیل کے زور سے حقیقت کو دبا دیتا ہے۔ مثلاً ابر و بہار کا حال کہتا ہے:۔

سحاب از تیر باران بہاری — بہ بستاں جملہ گلہا را نشان کرد
بنوے آتش گل دیگر گرفتست — کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد

شہزادہ **شجاع** کے ساتھ بھی خصوصیت رہی پھر **عبداللہ قطب شاہ** کے پاس دکن گیا۔ یہاں اسکے باپ میر ابو تراب کا انتقال ہو گیا۔ اسی رنج میں یہ رباعی کہی :۔

دانش مکن اعتماد بر عمر دراز	کاید بریان کم بسر عمر دراز
گیرم کہ چو عیسیٰ بہ فلک بر شدۂ	آید بچہ کار بے پدر عمر دراز

آخر ۱۰۶۲ھ میں قطب شاہ کی طرف سے نائب الزیارۃ ہو کے مشہد مقدس چلا گیا اور ۱۰۷۰ھ میں وہیں رحلت کر گیا۔ بعض اشعار درج کئے جاتے ہیں تاکہ رنگ طبیعت کا اندازہ ہو سکے :۔

مرا کہ خندۂ گل سر بدرد می آورد	دماغ گریۂ بلبل درین بہار کجاست
تو بہار است ہوا مایۂ عشرت دارد	مفت رندی است کسے دارد و فرصت دارد
اے ہما از سر ما خاک نشیناں مگذر	سایۂ بال تو بدنامیِ دولت دارد

تمثیلیہ رنگ ملاحظہ ہو :۔

مرد دانا بہ ہنر زندۂ اقران گردد	میوہ رنگیں چو شد از برگ نمایاں گردد
پس از وفات کہ یاد کند بخور غم خویش	چو خون مردہ سیہ پوش شو بماتم خویش

قدسی

قدسی ۔ حاجی محمد جان مشہدی ۱۰۴۲ھ میں ہندوستان آیا اور شاہجہان کے دربار میں باریاب ہوا اور وہیں ملازم رہا۔ سال وفات ۱۰۵۶ھ ہے اور مدفن لاہور۔ قصائد میں اسے ید طولیٰ تھا اور بعض نقادوں کا خیال ہے کہ **کلیم** نے قصیدہ گوئی میں اسی کا رنگ اختیار کیا تھا۔ انداز کلام ملاحظہ ہو :۔

زبسکہ کوہ کشید است نم ز ابر مطیر	توان کشید رگ از سنگ ہمچو موز خمیر
چو خاک پیرہن غنچہ باد پیمایاں	کنند رخنۂ دیوار را ز گل تعمیر
سحاب شست لب غنچہ را چنداں آب	برائے آنکہ زند بوسہ بر رکاب امیر

چند تخئیل اسکے کلام میں ضرور ہے لیکن حقیقت کا پردہ پوش ہوجانا کچھ اچھا نہیں

ظہوری

ظہوری ترشیزی ۔ظہورالدین نام ۔ترشیز وطن ۔علوم و فنون میں دستگاہ حاصل کرنے کے بعد دکن آیا اور عادلشاہیوں کے دربار میں داخل ہوا ۔ایک **ساقی نامہ** برہان شاہ والئی احمد نگر کو نذر کیا ۔بادشاہ نے چند ہاتھی نقد و جنس لاد کے انعام میں بھیجے ۔کہتے ہیں کہ جب انعام پہونچا تو ظہوری قہوہ خانہ میں حقہ پی رہا تھا ۔کارپردازان سلطنت نے رسید مانگی تو ایک پرچہ پر لکھ دیا کہ "تسلیم کردند تسلیم کردم"۔ ایک مرتبہ عرفی کے پاس ایک شال بھیجی ۔عرفی نے ہجو میں تین رباعیاں کہہ کے بھیجیں جنمیں سے ایک یہ ہے :۔

این شال کہ وصفش نہ حد تقریر است   آیات رعونت مرا تفسیر است

نامش نکنی قماش کشمیر کزو   صد رخنہ بکار مردم کشمیر است

ابراہیم عادلشاہ نے ظہوری کی بہت قدر دانی کی اور ظہوری کے تصنیفات کی بدولت اس کا نام بھی آجتک دنیائے ادب میں زندہ ہے ۔۱۰۲۵ھ میں ظہوری نے وفات پائی اور دکن میں دفن ہوا اور سہ نثر و ساقی نامہ و کلیات غزل و قصائد یادگار چھوڑے ۔نظم میں تقریباً ہر صنف میں کمال فن دکھایا ہے ۔اگرچہ مضمون آفرینی اور استعارہ بندی بکثرت ہے مگر سلاست و فصاحت بدرجۂ کمال موجود ہے خصوصاً مثنوی سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا ۔مثلاً ابراہیم عادلشاہ کی تعریف میں کہتا ہے :۔

کعبۂ اہل دل ابراہیم باد   قبلۂ نہ چرخ و ہفت اقلیم باد

از مہ تو پشت دستے بر زمیں   پیش قدرش چرخ در تسلیم[۱] باد

---

[۱] سلطنت مغلیہ میں سلام کرنے کے دو طریقے رائج تھے تسلیم اور کورنش ۔تسلیم کے لئے زمین پر پشت دست رکھتے تھے اور آہستہ آہستہ اٹھاکے پیشانی پر رکھتے تھے ۔کورنش کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک مرتبہ ہمایوں نے اکبر کو کم سنی میں ایک تاج پہننے کو دیا ۔یہ تاج سر سے کسی قدر بڑا تھا اکبر جب باپ کے سامنے تسلیم کرنے کو جھکا تو سر سے تاج گرنے لگا ۔فوراً ہاتھ پیشانی پر رکھ کے جھک گیا اور تاج کو سنبھال لیا ۔ہمایوں نے بیٹے کی محبت میں یہ طریقہ بھی جاری کر دیا ۔(آئین اکبری)

کارو کام میں **تجنیس لاحق** ہے۔ (۱۲) کام و زبان میں **مراعات النظیر**۔ (۱۳) شہد و عذب و شکر میں **مراعات النظیر**۔ (۱۴) رگ و پے **مراعات النظیر**۔ (۱۵) و (۱۶) و (۱۷) پے و نے **مبادلۃ الراسین تصحیف۔ سجع**۔ (۱۸) شکر و نی **ایہام تناسب** وغیرہ وغیرہ۔ غرض ظہوری کی ذات پر ان تمام تکلفات کا اس حیثیت سے خاتمہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے بہتر اس رنگ میں کوئی نثر نہیں لکھ سکا اسی وجہ سے صاحب خزائنہ عامرہ کی رائے ہے کہ "از جواہر زواہر گزراشیدہ"۔

نعمتخان عالی

عالی۔ میرزا محمد پسر حکیم محمد فتح الدین شیرازی۔ مقام ولادت ہندوستان۔ اورنگ زیب نے نعمتخان خطاب دیکے اپنا مصاحب اور ندیم مقرر کیا کہتے ہیں کہ جب تقرب زیادہ ہوا تو **مقرب خان** خطاب ملا۔ اسی عہد سلطنت میں انشاپردازی کا بھی موقع ملا خصوصاً ظرافت کا جس کو عالمانہ انداز میں لا کے بہت بلند پایہ کر دیا۔ ایک مرتبہ ایک جیغہ زیب النسا بیگم کے یہاں بیچنے کو بھیجا۔ عرصے تک قیمت نہ ملی۔ یاد دہانی کے طور پر لکھا:۔

ای بندگیت سعادتِ اخترِ من	در خدمتِ تو عیاں شدہ جوہرِ من
گر جیغہ خریدنی است پس کو زرِ من	ور نیست خریدنی بزن بر سرِ من

زیب النسا ہنس دی اور جیغہ کے ساتھ پانچ ہزار روپیہ انعام دئے۔ بہادر شاہ اول کے زمانے میں اور بھی عزت بڑھی اور دانشمند خان خطاب ملا بلکہ شاہنامہ تحریر کرنے پر مامور ہوا مگر ۱۱۲۱ھ میں رحلت کر گیا اور **وقائع** نعمتخان عالی **جنگ نامہ** نعمتخان عالی **مضحکات**۔ مجموعہ **قصائد و غزلیات** وغیرہ یادگار چھوڑے۔

حقیقت یہ ہے کہ دورِ آخر میں نعمتخان **عالی** نظم و نثر دونوں میں ممتاز ہے۔ **جنگ نامہ** میں معظم و اعظم پسران اورنگ زیب کی خانہ جنگی کا حال لکھا ہے۔ فقرات اکثر اپنے زمانے کے مذاق کے موافق طویل ہیں اور مرادفات کی کثرت مگر پختگی ہر بد مذاقی کو

زصدمہ[1] گوش ملائک بر آسماں کر شد   زبسکہ نعرۂ شاباش و واہ واہ رسید

شگفتگی ز تبسم بخندہ منجر شد   گذشت باز ازاں ہم بہ قاہ قاہ رسید

بصحبتے شدہ مشغول ہر یکے طرفے   کہ کیفِ شادیِ شاں زود چوں نگاہ رسید

یکے بہ بحث کہ فالِ نست آمدہ براست   تمام شد غمِ دل حالتِ رفاہ رسید

اسکے بعد ہر ایک کے کوچ کا ارادہ مختلف پیرایوں میں دکھایا ہے کہ کوئی اونٹ مانگتا ہے کوئی گھوڑا تیار کراتا ہے :-

یکے نوشت کہ پالاں بدوز اے ظالم   چہ پر سکالم[2] انیست چوب و کاہ رسید

غرض ایک عجیب خلفشار ہے کہ ناگہاں

زقلعہ گولہ افتاد اندریں اثنا   کشید نالہ اجل کشتہ گو آہ ار رسید!

یکے نیساں شمر جست و زیر سنگ خزید   یکے چو شعلہ دواں شد کہ تا پناہ رسید

ہنوز بر لب او بود ایں سخن کز دور   گلولۂ دگر آمد بپارہ گاہ رسید

یکے بہ پشتہ برآمد کہ من ببینم چیست   بلند شد دو سہ گاہے بقعر چاہ رسید

یکجا نشست دیگرے از جاکہ ہیچو باد پلہ   ازاں وقوف گلولہ بقتل گاہ رسید

مدبرے بعقب رفت دو بیں طلبید   بدید و گفت شکستے بہ ایں سپاہ رسید

دریں معاملہ بودند تا خبر آمد   کہ چشم زخم[3] عظیمے بفوج شاہ رسید

مضحکات میں دقتِ نظر بہت کرنی ہوتی ہے اور اسکے عبارات اور مطالب وقائع سے کہیں زائد دشوار ہیں۔ قصائد میں سلاست اور شیرینی بہت ہے البتہ مضامین عالیہ کی کمی ہوگئی ہے مگر یہ زمانے کا انقلاب ہے۔ عرفی و فیضی کے بعد سے فلسفیت اور مضامین بلند کا گویا خاتمہ ہی ہوگیا اور قصیدہ گوئی کا مذاق ہی بدل گیا۔ یہی غنیمت ہے کہ استعاروں کی رنگ آمیزی میں حقیقت کو نہیں چھپاتا اور

---

[1] طنزیہ۔ [2] چھیڑ۔ [3] نظر بد کا اثر۔

کی ملازمت میں رہا اور چند سال وہاں بسر کئے پھر سرہند چلا آیا مگر وہاں اطمینان سے
رہنے نہ پایا۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک دن شیخ محمد معصوم ایک باغ میں گئے دیکھا کہ ناصر علی
تنہا ہے اور شراب نوشی کا سامان سامنے رکھا ہے پوچھا "یہ کیا" کہا کہ "یہ وہ شراب
ہے جسے ملائکہ پیتے ہیں"۔ شیخ غضبناک ہو کے واپس آیا اور صوفیوں اور عالموں نے
اسکے واجب القتل ہونے کا محضر تیار کیا مہر محمد خان راسخ اپنے رفیقوں کے ساتھ
مسلح ہو کے آئے اور ناصر علی کو اپنی حفاظت میں دہلی لے گئے ورنہ جان نہ بچتی۔ دہلی
میں بھی شغل مے نوشی جاری رہا۔ ایک دن باغ میں بیٹھا ہوا صراحی سے جام بھر رہا
تھا اور شراب میں کف پیدا ہو رہا تھا۔ ناصر علی پر کیفیت طاری ہوا اور یہ شعر کہا :۔

کدامیں مست را امشب سر جنگ است یا زاہد　　کہ مینا ہم ز جوش مے زرہ زیر قبا دارد

کہتے ہیں کہ آخر عمر میں شراب سے توبہ کر لی اور شیخ محمد معصوم کا مرید ہو گیا تھا
واللہ اعلم۔ ذوالفقار خاں بھی اسکے خاص قدردانوں میں تھا۔ اول ملاقات
میں جو مدحیہ غزل پیش کی اس کا مطلع آج تک مشہور ہے :۔

اے شان حیدری ز جبین تو آشکار　　نامم تو در نبرد کند کار ذوالفقار

اس غزل پر انعام میں تیس ہزار روپے پائے اور سب تقسیم کر دیے۔ ذوالفقار خاں
کے ساتھ بیجاپور اور کرناٹک وغیرہ میں رہا اور اسی کے ساتھ پھر دہلی واپس آیا۔
اور قلندرانہ زندگی بسر کرنے لگا آخر ۳ رمضان ۱۱۰۸ھ کو رحلت کر گیا اور
ایک دیوان اور مثنوی بطور یادگار چھوڑ دی۔ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ
نازک خیالی اور مضمون آفرینی کو حد اعتدال سے بڑھا دیا اور استعارات کی زنجیروں
میں آزادی خیال کو جکڑ دیا۔ نزاکت ادا اور سلاست بیان کے خاتمہ کے سامان
فراہم ہونے لگے "ہیچ ہیچ" ہی "ہوت ہوت" باقی رہ گئی لیکن استادانہ قوت ان سب
باتوں پر جہاں پردہ ڈال دیتی ہے وہاں جدت اور نقادوں کی نظر کو خیرہ

کلام میں جدید استعارے اور نئے تصرفات بکثرت ہیں بلکہ بعض ایسے ہیں کہ زباندانانِ عجم اُن پر اعتراض کرتے ہیں جیسے "خرام کاشتن" وغیرہ۔ نظم و نثر دونوں مذاق تصوّف میں زیادہ تر ہیں اور مضامین سے زائد عنوان ادا پیچدار اور دقیق ہوتا ہے۔ لیکن بااینہمہ اگر صاف اشعار علیحدہ کر لئے جائیں تو بلند نظری کی کافی سند ہیں۔ نئی نئی بحروں میں بھی اکثر غزلیں نظم کی ہیں مگر استعارہ اور تخییل در تخییل کا رنگ اسقدر غالب ہے کہ کلام اُلجھ کے رہ گیا ہے اور بعض اوقات بالکل چیستان ہو جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ رنگ اور ترقی کرتا تو ہندوستان کے فارسی شاعر محض معمّا گو ہو کے رہ جاتے۔ اب ہم بعض نمونے انکے کلام کے پیش کرتے ہیں۔ نکات میں کہتے ہیں:۔

"اگر منکرِ نبوت نہٖ باخطرات جز بہ تعظیم پیش میا و اگر بر تجلی ایمان داری
بہ ہیچ جانب بے ادب چشم مکشا"

دیکھو یہ رنگ بالکل ظہوری کے رنگ سے برعکس ہے۔ مطالب بہت زیادہ ہیں اور الفاظ نہایت کم بلکہ قلّتِ الفاظ کی حد اس قدر قابل گرفت ہے کہ بعض اوقات محض مطالب جلیلہ پر اشارے کر دیتے ہیں۔ نظم میں بھی یہی حالت ہے۔ مثلاً کہنا اتنا ہے کہ اس دنیائے فانی میں ہمارا وجود دو عدموں کے درمیان ہے۔ شاعرانہ تخییل میں کہہ سکتے تھے "یعنے میانۂ دو سراب است ہستیم" مگر پیچدار طبیعت استعاروں کی بیڑیاں پہنائے بغیر مضمون کو قیدِ نظم میں لاہی نہیں سکتی۔ کہتے ہیں:۔

بیدار ئیے میانِ دو خواب است ہستیم گردِ تخیّلِ دو سراب است ہستیم

پہلا مصرعہ غزالی مشہدی کے شعر کا خلاصہ ہے۔ کہتا ہے:۔

شورے شد و از خواب عدم دیدہ کشودیم دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

یہ خلاصہ کے مضمونِ غزالی سے بیحد پست ہو گیا اور جو اپنا خیال تھا وہ اسیر زندانِ استعارات ہو گیا۔ صاف رنگ کے اشعار اسی غزل کے ملاحظہ ہوں:۔

تھوڑے ہی عرصے میں درجۂ اجتہاد پر فائز ہو گئے۔ فن شعر سے مناسبت خداداد تھی اور بچپن ہی سے نظم کا شوق ہو گیا تھا۔ باپ چاہتے تھے کہ یہ شوق چھوٹ جائے تاکہ طلب علم میں حرج نہ ہو مگر مقتضیات فطرت کا انفکاک محال ہے۔ آخر فنِ شعر میں بھی کامل ہو گئے جب نادر شاہ کا حملہ ہوا تو ایران سے بھاگ کے ہندوستان میں آئے اور اپنی سوانحعمری یہیں تحریر کی۔ لاہور و دہلی میں کچھ عرصے تک رہے مگر یہ شہر ناپسند ہوئے۔ آخر بنارس آئے اور وہیں کے ہو رہے خود کہتے ہیں :۔

از بنارس نروم معبدِ عام است اینجا　　　　ہر برہمن پسرے لچھمن و رام است اینجا

۱۱ رجمادی الاولیٰ ۱۱۸۰ھ میں وفات ہوئی اور اپنے روضۂ فاطمان میں دفن کئے گئے قبر پر یہ اشعار انھیں کے خط میں کندہ ہیں :۔

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم　　　　سرِ شوریدہ بر بالینِ آسائش رسید اینجا

روشن شد از وصال تو شبہائے تار ما　　　　صبحِ قیامت است چراغِ مزار ما

نثر کی تحریر سادہ اور دلکش ہے۔ واقعات کے بیان میں رنگینی یک قلم ترک کر دی ہے ہاں! استعارات و تشبیہات مانوس سے کہیں کہیں عبارت کو زینت دیدی ہے۔ نمونہ کے طور پر وہ عبارت سوانحعمری کی نقل کیجاتی ہے جس سے انکی ابتدائی شاعری کا بھی اندازہ ہو جائیگا :۔

"روزے در مجلس والد علامہ جمعے از مستعدان منعقد بود و مراہم دران مجلس طلبیدند واز ہر جا سخنے درمیان بود یکے از حاضران این بیت ملا محتشم کاشی را برخواند :۔

اے قامتِ بلند قدان در کمند تو　　　　رعنائی آفریدۂ قدِ بلند تو

بعضے از حضار تحسینِ بلیغ نمودہ۔ والد مرحوم فرمود کہ دیوان ملا محتشم بنظر من در آمدہ۔ استاد ست اما کلامش بے نمک است و آن مقدار حلاوت کہ تدارک بے نمکی کند ندارد و با آنکہ نمک در سخن شاید گلو سوز تر باشد از حلاوت چنانچہ از ہمیں

حقیقت عشق کا بعد فنا قائم رہنا اور اپنے آثار کو ظاہر کرنا ایک مؤثر طریقے میں نظم کیا ہے اور لفظ "مزار" (زیارت گاہ) سے شہیدِ عشق کی عظمت ظاہر کی ہے۔ یا مثلاً یہ خیال کہ حسن کی کشش تو عاشقانِ صادق اور ہوس پیشہ لوگوں کے لئے باعتبار صورت یکساں ہے البتہ آلامِ عشق کے جھیلنے کا انداز دونوں میں امتیاز کر دیتا ہے۔ اس مضمون کو نہایت دلکش الفاظ میں ادا کرتے ہیں :۔

نہ برد جلوۂ گل جانبِ گلزار مرا　　　می برد نالۂ مرغانِ گرفتار مرا

بیخودی کی لذت کا اظہار ہے اور اگر خودی کا احساس رہے تو حیات ابدی سے بھی انکار :۔

حیات آنرا شمارم کز خودی بستاندم ساقی　　　بجامے میفروشم شربتِ خضر و مسیحا را

اپنی گری ہوئی حالت کا اظہار اور معشوق کے تقرب سے اطمینان :۔

گرچہ ما سبزۂ خوابیدۂ ایں گلزاریم　　　سیر ما در قدمِ سروِ سرافرازے ہست

دنیا کو چاہے کوئی لذت و عیش کا مقام سمجھے اور یہ خیال صحیح بھی ہو مگر جنکی فطرت میں ذوقِ عشق داخل ہے انکی حالت یہ ہے :۔

تہمت آلودۂ عیشیم کہ گلشن زادیم　　　پر و بالے نکشودیم کہ صیاد آمد

صائب کے رنگ میں اخلاقی نصیحت :۔

گذشت از خوردۂ شبنم گل و زد خیمہ بر گردون

بدولت میرسد ہر کس کہ از زر دست بردارد
سعادت ابدی ۱۲

دیوان حزیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوشش یہ نہیں کہ خواہ مخواہ طویل غزلیں نظم کریں اور ہر قافیہ کو کسی نہ کسی طرح باندھیں ضرور۔ جتنے شعر کسی زمین میں مزے کے نکل آتے ہیں انھیں پر اکتفا کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت کلیات پیش نظر نہیں ورنہ مثنوی اور قصائد کے بارے میں بھی لکھا جاتا۔

غالب[۱] دہلوی۔ نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ

---

[۱] تفصیلی حالات "یادگارِ غالب" مؤلفہ شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی میں ملیں گے۔

گرد آوردہ بدین سرزمین روان داشت۔ چوں شاہ سپاہ را نتوانست راند سپاہ فرود آمد و شاہ فرو ماند۔

شاہ در او میاں گرفت سپاہ   دین گرفتن بود گرفتن ماہ

ماہ نو ہیچگہ نمیگیرد   جز مہ چاردہ نمیگیرد

شاہ ماہ گرفتہ را ماند   نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

نظم میں غالب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ابتدا میں بیدل اور ناصر علی کی عام پسندی نے انھیں بھی دھوکا دیا مگر رفتہ رفتہ حافظ و سعدی کے دلدادہ ہوئے اور کلام میں اثر خاص پیدا کر لیا۔ قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ رباعی ہر صنف میں کمال دکھایا ہے اور ہندیوں کو نظر اہل ایران میں سرخرو کیا ہے۔ کسی نے خوب کہا کہ ہندوستانیوں میں فارسی شاعری ایک ترک لاچین (امیر خسرو) نے شروع کی اور ایک ترک ایبک (میرزا غالب) نے ختم کر دی۔ خود کو بھی اپنی فارسی شاعری پہ ناز ہے۔ ایک شخص پر طنز آ کہتے ہیں:۔

ایکہ در بزم شہنشاہ سخن رس گفتۂ   کے بہ پر گوئی فلاں در شعر ہمسنگ منست

راست گفتی لیک میدانی کہ نبود جائے طعن   کمتر از بانگ دہل گر نغمۂ چنگ منست

فارسی بین تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

راست میگویم من از راستی نتواں کشید   ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

طنز یہ رنگ میں ایک خاص مزہ ہے۔ زاہدان ریائی کی حیثیت سنو:۔

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار   ساقی و مغنی و شرابے و سرودے

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بسجودے و نبی را بدرودے

قصائد میں سلاست اور روانی انکے لئے مخصوص ہے۔ افسوس کہ قاآنی کا کلام آخر وقت میں انکے پاس پہونچا ورنہ خدا جانے کیا کرتے۔ ایک تشبیب کے چند اشعار سنو:۔

گفتم حدیث دوست بقرآن برابر ست   نازم بکفر خود کہ بایمان برابر ست

اے بخلا و ملا خوے تو ہنگامہ زا — با ہمہ بے گفتگو بے ہمہ با ماجرا
شاہد حسن ترا در روش دلبری — طرۂ پرخم صفات موے میان ماسوا
بزم ترا شمع و گل خستگی بو تراب — ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

شوق دیدار کا جوش دیکھو:۔

زمن گرت نبود باور انتظار بیا — بہانہ جوے مباش و ستیزہ کار بیا
بیک دو شیوہ ستم دل نمی شود خرسند — بمرگ من کہ بسامان روزگار بیا
وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

جدت تخییل اور تازگی بیان کا اندازہ کرو:۔

دماغ اہل فنا نشۂ بلا دارد — بفرق قم ارّہ طلوع پر ہما دارد
دلم فسردہ بیفزا بوعدہ ذوق وصال — چراغ کشتہ ہمان شعلہ خونبہا دارد
دل نہ تنہا ز فراق تو فغاں ساز دہد — رفتن عکس تو از آئینہ آواز دہد
دل چہ بندد ستم از دوست نشاط آغازد — شیشہ ساز نیست کہ تا بشکند آواز دہد
آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است — بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

خاتمہ

ہم نہایت حسرت کے ساتھ یہ دور ختم کرتے ہیں۔ ہجوم افکار نے دل توڑ دیا ہے۔ حادثات جانگزا روح فرسائی کر رہے ہیں۔ نثر میں جس کثرت سے کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اُن کا ذکر خود ایک مستقل کتاب کا طالب ہے۔ مآثر الامرا۔ شاہجہاں نامۂ عبد الحمید لاہوری۔ سیر المتاخرین کی ایسی کتابیں فن تاریخ میں۔ مدارج النبوۃ۔ جذب القلوب الی دیار المحبوب وغیرہ سیرت میں۔ طب اکبر۔ مفرح القلوب۔ اکسیر اعظم وغیرہ طب میں۔ تحفہ اثنا عشریہ۔ عبقات الانوار۔ جواہر عبقریہ وغیرہ علم کلام میں۔ غرض ہر فن میں مستقل تصانیف بیش بہا ہندوستان نے فارسی لٹریچر میں اضافہ کئے ہیں۔ یہ کوشش محض مسلمانوں تک

مثنوی میں واقعات کے بیان سے کمال معلوم ہوتا ہے۔ اُلجھاؤ سے بچنا اور حقیقت کو شاعری کے پردے میں نہ چھپا لینا یہی خوبی اوا کی نشانی ہے۔ دیکھو باغ کی تعریف کس لطف سے کرتا ہے :-

درین گلشن ز گلہا دستہ دستہ　　صبا در ہر طرف گلدستہ بستہ
ہوایش دلکشا و دل نشین است　　طراوت خانہ زاد این زمین است
شگفتہ ہر طرف گلہائے لالہ　　گرفتہ بر کفِ عشرت پیالہ
چو دیدم آب و رنگ بوستان را　　صلائے عیش دادم دوستان را
زبان در وصفِ گل بیتاب گردید　　سخن تا بر لب آمد آب گردید
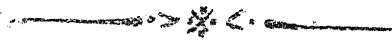
استیصال اور میرزا علی محمد باب اور قرۃ العین وغیرہ اس فرقے کے سرگروہوں کا قتل اس زمانے کے اہم واقعات سے ہے۔ ناصر الدین شاہ نے دوبارہ سفر یوروپ کیا اور ممالک خارجہ سے دوستانہ تعلقات قائم کر کے سفارت خانے کھولے۔

مظفر الدین شاہ

آخر میرزا محمد رضا کے باب نے ۱۳۱۳ھ میں شہید کیا۔ مظفر الدین شاہ ان کے فرزند جب جانشین ہوئے تو ایران میں حریت کا جوش پھیلا اور آخر میں رعایا کو سلطنت مشروطہ مل گئی۔

محمد علی شاہ

۱۳۲۴ھ میں انکا بیٹا محمد علی شاہ وارث ہوا مگر مشروطہ سے مخالف ہونے کی وجہ سے چار سال کے بعد معزول کر دیا گیا اور اسکا بیٹا

احمد شاہ

احمد شاہ برائے نام بادشاہ بنایا گیا۔ جب یہ بڑا ہو کے صاحب اختیار ہوا تو ملک سے غافل ہو کے یوروپ میں عیش کرنے لگا۔ بالآخر جمادی الاول ۱۳۴۴ھ (مطابق نومبر ۱۹۲۵ء) میں اسے معزول کر کے سردار رضا خاں مازندرانی کو صدر سلطنت جمہوریہ قرار دیا

رضا شاہ پہلوی اور خاتمہ عہد قاچاریہ

۱۲۔ شوال ۱۳۴۴ھ (مطابق ۲۵۔ اپریل ۱۹۲۶ء) کو رضا شاہ پہلوی کا لقب اختیار کر کے تاجدار ایران ہوئے اور دور قاچاریہ کا خاتمہ ہو کے عہد پہلویہ کا آغاز ہوا۔

لٹریچر پر انقلاب

عہد قاچاریہ میں جو انقلاب نظم و نثر میں ہوا وہ نہایت عظیم الشان ہے مغربی ممالک سے تعلقات بڑھ جانا۔ متاخرین کی بیچدار ترکیبوں اور خیالوں سے پریشان ہونا۔ شاہنامہ اور مثنوی معنوی کی طرز اداپسند آجانا۔ ان تمام امور کا نتیجہ یہ ہوا کہ انشائے عجم کی کایا پلٹ گئی۔ عہد تیموریہ کی نازک خیالی اور دورۂ صفویہ کی معاملہ بندی دونوں سے طبیعتیں ہٹ گئیں کسی رنگ کو پریشان گوئی کہنے لگے کسی کو بیہودہ سرائی۔ بلکہ صاحب مجمع الفصحا کے خیال میں فارسی شاعری پستی کے بدترین درجے پہ پہنچ گئی تھی کہ عہد قاچاریہ کے شعرا نے اپنا رنگ بدلا۔

اتنا جھکے ہیں کہ "دندان تو جملہ در دہانند + چشمان تو زیر ابروانند" کے حدود کے قریب
پہونچ گئے ہیں ہاں! بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی صنف میں
امتیاز پیدا کیا ہے اور اپنے عصر کے انقلاب کو قائم رکھکے نظم و نثر میں
فروغ حاصل کیا ہے۔ ایسے چند لوگوں کا بلا امتیاز جاہ و منصب ذکر کیا جاتا ہے
تاکہ ناظرین اندازہ کرلیں کہ اس رجعت قہقری کی بہترین صورت کہاں تک
پہونچی ہے۔ قاآنی البتہ اس عہد کا مایۂ ناز ہے جس کا حال کسی قدر تفصیل
سے لکھا جائے گا۔ ایک امر اور یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ مذہبی
تصانیف اس دور میں بھی ہوتی ہیں مگر علما کی عبارت ان انشا پردازوں سے
بالکل جدا ہے۔ خصوصاً مسائل فقہ تو ایسی عجیب طرز میں لکھے جاتے ہیں کہ سمجھنا
دشوار ہو جاتا ہے کیونکہ اصول فقہ کی تحقیق اس دور میں حد کمال تک پہنچ گئی
ہے اور علمائے ملت کا ذوق اس فن شریف کی طرف اس قدر بڑھ گیا ہے کہ
سیدھے سے سیدھا مسئلہ بھی اصولی اور منطقی زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے۔
کاش! یہ طبقہ بھی سادہ نویسی کی طرف مائل ہو جائے تو دورۂ حاضرہ کا انقلاب
یکساں نظر آئے۔ اب ہم فتحعلی شاہ کے زمانے سے چند خاص خاص شعرا اور
مصنفین کا حال شروع کرتے ہیں کیونکہ اسی وقت سے اطمینانی حالت
ایران میں پیدا ہوئی اور یہ انقلاب ظاہر ہونے لگا۔

صبا کاشانی

ملک الشعرا صبا کاشانی فتحعلی خاں نام فتحعلی شاہ کے
زمانے میں سرگروہ شعرا تھے۔ رعایات لفظی و معنوی کا بہت شوق ہے مثنویاں۔
شہنشاہ نامہ و خداوند نامہ وغیرہ نظم کیں اور قصائد مدحیہ بادشاہ اور امرا کی تعریف میں

عندلیب

کہے۔ ان کے بیٹے عندلیب بھی بعد کو ملک الشعرا ہوئے تھے۔ دونوں کا کلام
ایران میں شوق سے پڑھا جاتا ہے چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں

لطف شاعری کے ساتھ ساتھ روایات کا نہایت صحیح ترجمہ کیا ہے اور حتی الوسع بضرورت شاعری بھی حقیقت سے زائد نہیں لکھا ہے۔ بعض مقامات پر لفظی ترجمہ نہیں ہے مگر غرض اور اصلیت وہی ہے جسے "زبان حال" سے تعبیر کرنا چاہیے۔ مثلاً اسی معرکہ میں رسول اللہ صلعم نے فرمایا ھذا عمرو ! اور امیر المومنین نے جواب دیا تھا وانا علی لیکن ان مختصر الفاظ میں سوال و جواب سے غرض دونوں کی شجاعت کا اعلام ہے۔ شاعر نے پہلے مصرعوں میں ترجمہ رکھا اور دوسرے مصرعوں میں بزبان شاعری تفسیر کر دی ہے۔ فافہم۔

نشاط اصفہانی

میرزا عبد الوہاب نشاط اصفہانی (المتوفی ۱۲۴۴ھ) فتحعلی شاہ کے دربار میں نہایت معزز تھا اور معتمد الدولہ خطاب تھا۔ فلسفیانہ رنگ اسکی ذات سے اس دور میں مقبول ہوا۔ صاحب مجمع الفصحا کا خیال ہے کہ اس جامعیت کا آدمی مشکل سے ملتا ہے۔ فصاحت کلام اور شوخی طبع میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ ایک مرتبہ موسم بہار میں عید آئی ہے۔ اس نے قصیدہ نظم کیا اور اس کی تشبیب میں اس کا نقشہ دکھایا :-

بر لالہ ژالہ می چکد از ابر شب کفام — خوش تر ز ژالہ بادہ و بہتر ز لالہ جام
صبح است و بزم عید و نے و مطرب و نبیذ — دولت مرید و بخت سعید و جہاں بکام
گلزار را طراوت و ایام را نشاط — افلاک را سعادت و آفاق را نظام
باشد حلال توبہ نباشد اگر ز مے — باشد حرام بادہ نباشد اگر بجام

متاخرین کی نازک خیالی کا رنگ اس کے کلام میں کبھی کبھی آ جاتا ہے چنانچہ اس قصیدے میں بھی یہ شعر کہہ گیا ہے :-

از فیض بادہ لطف ہوا جاوداں زید — نقشے اگر بر آب نگارند در منام (خواب ۱۲)

فلسفیانہ مذاق خاص طور سے محبوب تھا۔ آفرینش کے حال میں ایک قصیدے کی

می نہ بینی شیشہا را بیش و کم نزدیک و دور	در خور خود پرتوے از تابش خور داشتند
انبساطات وجود از اعتبارات حدود	ہمچو ظل در قرب و بعد مہر انور داشتند
در بگوئی اعتبارے کے اثر آمد پدید	گویم این آثار ہم او بام مظہر داشتند

گر یہ دیکھو کتنی صاف ہے :-

از پئے نظم دو عالم در پئے ہم یک بیک	شاہ بر شاہ و پیمبر بر پیمبر داشتند
در ظہور احمدی ختم نبوت خواستند	سلطنت را ختم بر شاہ مظفر داشتند

غرض اس قسم کی تمہید میں اکثر شعرا کے کلام میں ملیں گی اور ظاہر ہو جائے گا کہ یہ دور کتنا متقدمین کا دلدادہ اور متاخرین سے کشیدہ ہے۔

وصال شیرازی ۔ مرزا شفیع نام اور مرزا کوچک لقب۔ خوبصورت اور خوش آواز شاعر تھا۔ روحانیت میں میرزا ابوالقاسم شیرازی سے ارادت تھی۔ اس کی محفل میں اصحاب حال کا مجمع رہتا تھا۔ خوشنویسی میں بھی کمال تھا اور بڑے خطاط استاد مانے جاتے تھے۔ ناموافقت زمانہ نے گوشہ نشین کر دیا تھا۔ ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان قصائد و غزلیات کا یادگار ہے اور ایک مثنوی وحشی کی شیرین و فرہاد کا تتمہ اور ایک پوری مثنوی بزم **وصال** ۔ ناظرین کے لئے ایک مشکل ردیف کا قصیدہ منتخب کیا جاتا ہے۔ ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے :-

چہ چہرہ است کہ گرفتار زیبائے آتش و آب	بہر و ماہ از و افتخار آتش و آب
بطبع و لوی بہار و بہ رنگ و روی نگار	نہ بے بہار و نگار آتش و آب
بلون گوی لطافت یار مشتریان	بوے گوی شکست بار آتش و آب
کند بجائے چشم و کند بجائے رخ	شگفت نیست کہ بہت زیبائے آتش و آب
بطبع ہر کہ کند گرد چوں خلیل و کلیم	ہراس می نکند از گزائے آتش و آب

ایک قصیدہ قاآنی کا مشہور جیسا آتش۔ گر بیا آتش والے قصیدے کے

فی الحقیقت یغما کا امتیاز خطوط نگاری میں ہے۔ زبان خالص فارسی ہے اور ترکیبیں نادر الوجود۔ اس رنگ میں دوسرا لکھنے والا نظر نہیں آتا۔ ظرافت اور جودت ہر جملے سے ٹپکتی ہے۔ سلاست زبان کے ساتھ پختگی بیحد ہے۔ انھیں نادر ترکیبوں کے مجموعے کو "مجعولاتِ یغما" کہتے ہیں"۔ مثلاً یہ لکھنا ہے کہ مختلف الاقوام اور مختلف الخیال لوگ جمع ہو گئے اور جھوٹ سچ اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتے ہیں مگر ان پر غور کرنے والا کون ہے اور اچھے بُرے میں تمیز کرنے والا کہاں ہے۔ اس مطلب کو ایک خط میں یوں ادا کرتا ہے۔

"گروہے گوناگوں، ہریک براہ ورنگے دیگر، دریں انجمن بجائے و بارے، دارند و بر آئین و آہنگے بہتر یا بدتر، گفت وگذارے گرم و سرد میلانید، و پختۂ و خام ملیسرانید، و لے آنکہ گوش دارد کیست؟ یا ویلۂ سگ (بھوکنا) را از سروائے (وحی) سروش (فرشتہ) باز داند (امتیاز کرے) کدام؟"

آگے بڑھ کے کہتا ہے:۔

"آسودہ زی (آرام سے زندگی بسر کر) و آرام پائے (اور چین کر) کہ ایں قبیلہ گاؤ و خر را از سر تا دُم شناختہ ام و نہاد از ویلۂ ایں روبہان یلہ (دلیر) و بیلۂ (گروہ) گرگان بے تلہ (بدمعاش) یک گلّہ (سب کو) گوش تا صُم پرداختہ (اچھی طرح سمجھ لیا ہے)۔

میگویند و نمی شنویم، میخواستند و نمی کردیم"

اسی انداز پر بہ کثرت خطوط لکھے ہیں جو چھپ گئے ہیں۔ عربی کا ایک لفظ نہیں۔ سب خالص فارسی ہے اور اتنی فصیح و شیریں کہ اگر غور نہ کرو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایسی سخت اور دشوار صنف کا التزام کیا ہے اور ظرافت و متانت دونوں کو قائم رکھا ہے۔

حیدرے باید کہ تاخشم آرد و انگشت خویش | مرہ را دو پارہ تن ز اعجاز کراری کند
آدمی باید کہ شیطانے ز رحمانی فتد | یوسفے باید کہ در ایران سپہداری کند

اب معشوق کا حال ممدوح سے بیان کرتا ہے :-

سرورا! دیدم زلیخا طلعتے در مصرِ حسن | کان زلیخا بیند ار یوسف خریداری کند
تُرک مستی کز کمانِ ابرو و تیرِ مژہ | گر زند صد زخم بر دل یک بیک کاری کند
من سخن از وصل با او گویم و او از فراق | من بشیرینی سخن او تلخ گفتاری کند

اس کے بعد حسنِ طلب کا انداز بھی عجیب ہے۔ کہتا ہے یا تو اپنے غلام سے کہدے کہ مجھے شہر بدر کر دے :-

یا بگو دو ز ند چشم من کہ بر روی نکو | کم نگہ انداز دو دل را نگہداری کند
یا طبیبی جو کہ او دانا دوائے دردِ عشق | تا منِ شوریدہ را چندیں پرستاری کند
یا مرا زر دہ بدان مبلغ کہ آن زر پائے دل | گیرد و آزاد از دامِ گرفتاری کند

اس میں شبہہ نہیں کہ یہ عاشقی نہیں بلکہ ہوسناکی ہے۔ لیکن فصاحتِ بیان۔ سلاستِ زبان۔ جدّتِ اسلوب وغیرہ کی مثال میں یہ اشعار ضرور امتیاز رکھتے ہیں۔ ایک اور تمہید اور گریز ملاحظہ ہو :-

اے رفیقِ مہرباں والے شفیقِ کار بین | چند بیکاری بیا ئزیں بکار ہا کارے گزین
خواہی ار یابی تو زمزم رأبرو مکہ بیاب | خواہی ار بینی تو احمدؐ را، برو یثرب ببین
خواہی ار سلطاں شوی لشکر بکش بہ شرق و غرب | خواہی ار خاقاں شوی تسخیر فرما روم و چین
خواہی ار حاتم شوی زر آنچہ داری دہ بخلق | خواہی ار قاروں شوی سیم آنچہ داری کن دفین
خواہی ار کافر برو پیش رئیس الاشقیا | خواہی ار ایماں برو پیش امام الثقلین
سرورِ غالب علی بن ابیطالب کہ ہست | حجتِ حق، ساقیِ کوثر، امیر المومنین

شیطان ۱۲

حکیم قاآنی

قاآنی۔ میرزا حبیب اللہ بن میرزا ابوالحسن گلشن۔ آسی شاعر غیر

میں تھا مگر حلم و تواضع نے نظرِ خلق میں بھی مقبول و محبوب بنا دیا تھا نیکدلی اور خوش مزاجی کے ساتھ ظرافت اور شوخی نہایت مزہ دیتی تھی گلستان کا جواب پریشان بھی اسی شوخی کا نتیجہ ہے عجب مضحک قصے لکھے ہیں۔ اگر فحش نہ ہوتے تو یادگار رہتے۔ زبان کی پختگی اور ترکیب کی استواری ہر جگہ موجود ہے نمونہ کے لئے ایک صاف عبارت نقل کی جاتی ہے جس میں اپنے والد کے انتقال کا ذکر کیا ہے:۔

"یازدہ سالہ بودم کہ پدرم گلشن راشمع کمال بنور جمالش روشن بود خارے در پا رفت و ہنوز خارش در پا بود کہ کارش از دست شد[۱] چہ بمقتضائے ہرم[۲] ازاں خارش در پا ورمے حادث شد کہ طبیبان بدرمانش درماندند[۳] و اذا جاء اجلہم لا یستاخرون ساعۃ و لا یستقدمون[۴] فرو خواندند"

فن شعر میں بھی ظرافت طبع اکثر مقامات پر ظاہر ہوتی ہے۔ دو ہرکلوں کا مباحثہ انھیں کے لہجے میں نظم کیا ہے:۔ ایک بڈھا۔ ایک لڑکا جب فیصلہ ہوا تو:۔

طفل گفتا خدارا صمصدیار شکر | کز ہتم بجہاں از ملال و محن
ممن ہم گگلنگم ممثل تتتو | تو تو تو ہم گگلنگی ممثل ممن

یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ قاآنی نے فرانسیسی میں دستگاہ کامل حاصل کی تھی اور مغربی انداز نظم و نثر سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا علاوہ بریں عربی اور ترکی میں بھی کسی اہل زبان سے کم نہ تھا۔ فارسی مادری زبان تھی اور وہ بھی فصحائے شیراز

---

[۱] دیکھو کتنا پختہ تقابل ہے۔ [۲] بڑھاپا۔ [۳] درمان اور درماندند کی لطافت دیکھو۔ [۴] جب ان کا وقت مقرر آجاتا ہے تو نہ تاخیر کر سکتے ہیں نہ تقدیم۔ الآیہ۔

گفتگو کے انداز میں آکے پانی کر دینا اسی کا کام تھا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو شخص باتیں کر رہے ہیں اور وہ بھی عام فہم زبان میں۔

اسی طرح ایک قصیدے میں شاہنامہ کے واقعات کی تلمیح کا التزام کیا ہے۔ حقیقت میں نہایت شاندار ہے اور قابلِ نقل مگر بخوفِ طول ترک کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قاآنی اس عہد کا گل سر سبد ہے۔ مناظرِ فطرت کا نقشہ کھینچتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود کھڑا ہوا سیر کر رہا ہے اور لذّت کے جوش میں آکے بیان کرتا چلا جاتا ہے :۔

بگردون تیرہ ابرے بامدادان بر شد از دریا
جواہر خیز، د گوہر ریز، د گوہر بیز، د گوہر زا

ذرا انصاف سے کہنا! یہ ترصیع ہے یا حسن تکرار۔ یا پُر جوش دل کی آواز۔

چو چشم اہرمن خیرہ، چو روی زنگیان تیرہ
شدہ گفتی ہمہ چیرہ، بمغزش علّتِ سودا

دیکھو خیرہ۔ تیرہ۔ چیرہ۔ محض مبادلۃ الراسین یا سجع کے لئے نہیں ہیں بلکہ جس کیفیت کا ذکر مقصود ہے اِن سے بہتر الفاظ اُس کے ادا کرنے کے لئے مل نہیں سکتے۔ آگے کہتا ہے کہ کالے کالے بادل۔ صاف شفاف قطرے پانی کے برسا رہے ہیں۔ ذرا تشبیہات کی لطافت دیکھو۔ زبان کی روانی اُس پر لفظی صنعتیں مستزاد :۔

تنش با قیر آلودہ۔ دلش از شیر آمودہ
درون سو سرمہ سودہ۔ برون سو لولوے لالا
بدل گلشن بتن زندان، گہے گریان گہے خندان
چو در بزم طرب رندان ز شور نشئہ صہبا

گمان برم کہ ہمچو من بدام غم اسیر شد　　ز پا فگندہ دلبرش چہ خوب دستگیر شد

بلے چنیں برند دل ز عاشقاں نگارہا

اب اپنی ہجر کی مصیبت یاد آئی۔ لوگ معشوقوں کے ساتھ باغوں میں گھومتے ہیں اور جام پر جام پیتے ہیں۔ عاشقِ مہجور اپنے حالِ زار کو بیان کرتا ہے :-

درین بہار ہر کسے ہوای راغ داردا　　بیادِ باغ طلعتے خیالِ باغ داردا

بہ تیرہ شب ز جام مے بکف چراغ داردا　　ہمین دلِ من است بس کہ درد و داغ داردا

جگر چو لالہ پُر ز خون ز عشقِ گلعذارہا

دیکھو کیا عمدہ تشبیہ دی ہے۔ وصل کے زمانے میں اندھیری راتیں شراب کے جام سے روشن کی ہیں اور ہجران نصیب کے پاس اپنا دل ہے اور بس! جسمیں داغ ہیں اور درد۔ اس موسم بہار میں اس کا لالہ ایسی ہے کہ سرخ بھی ہے اور داغدار بھی ہے۔ ایک اور نئی تشبیہ سنو :-

بہار را چہ می کنم چو نیست در بہار من　　کنارہ کردم از جہاں چو او شد از کنار من

خوشا و خرم آن دمے کہ یار بود یار من　　دو زلفِ مشکبار او بچشمِ اشکبار من

دو چشمہ کہ اندرو شنا کنند مارہا

اس میں شک نہیں کہ قاآنی کی غزلیں بالکل قصیدے کا جزو معلوم ہوتی ہیں اور شانِ غزل سے کسی قدر خالی لیکن یہ مقامات اس کی تلافی کے لئے کافی ہیں۔ غزل کیا۔ واسوخت میں بھی یہ سوز و گداز پیدا ہونا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ غزل کے لئے یہ معذرت کی جاسکے کہ متقدمین کی تقلید کے جوش میں تغزل کا انداز بھی انھیں کا اختیار کر لیا اگرچہ یہ نہ چاہئے تھا۔

قاآنی کی طبیعت مشکل پسند بھی ہے اور دقیق مسائل بیان کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے مگر عنوان ادا ایسا سلجھا ہوا کہ سخت سے سخت مسائل پانی ہو جاتے ہیں۔

رضا جو ہو جاتا ہے اور معشوق "دلبر" یہ درجہ مودت ہے تیسرا درجہ محبت کا ہے۔ اِس درجے میں پہونچ کے معشوق سے اتحادِ خیال اور اتحادِ مذاق ہو جاتا ہے۔ جو عاشق چاہتا ہے وہی معشوق چاہتا ہے۔ جو معشوق چاہتا ہے وہی عاشق چاہتا ہے گویا عاشق و معشوق "یار" ہو جاتے ہیں۔ چوتھا درجہ خُلّت ہے۔ اس میں عاشق کے ارادے اور ولولے معشوق کے عشق میں مستہلک ہو جاتے ہیں اور ایسا از خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ معشوق کی جفاؤں میں بھی لذّت پاتا ہے۔ اُسے ہجر و وصل میں بھی امتیاز نہیں رہتا۔ پانچوں درجے میں مرتبۂ شہودی نصیب ہر وقت معشوق نظروں میں ہے اور اُسی تصویر تصوّری سے دفا اور آرام دل سب کچھ حاصل ہوتا ہے یہی عشق ہے۔ چھٹا درجہ ولہ ہے۔ یہ فنا فی المعشوق کا درجہ ہے خودی جاتی رہتی ہے اور بجز معشوق کچھ باقی نہیں رہتا۔ دیکھو اتنا بڑا مسئلہ چند لفظوں میں کس لطفِ تغزل کے ساتھ ادا کرتا ہے:۔

نگارا[۱]، دلبرا[۲]، یارا[۳]، دلآرا[۴]ما۔ دفادارا[۵]

خجل زیں نامہا بادی کہ مارا[۶] بے نشان کردی

قاآنی کی شوخ طبیعت اختراعِ محاورات پر بھی آمادہ رہتی ہے مثلاً تن پروری سخن پروری تو بولتے ہی ہیں۔ وہ مدح پروری شعر پروری وغیرہ نظم کر جاتا ہے اور نہایت لطف کے ساتھ۔ افسوس کہ کتاب طویل ہوتی جاتی ہے ورنہ قاآنی کی تنقید کا اقتضا تھا کہ پوری بحث اس کے کلام پہ کی جاتی۔ مؤلف نے تذکرہ و تبصرہ میں لکھا تھا کہ "وہ ہر کدام (شاعر) ہر چہ خوبتر است در کلام قاآنی بانتساب صدد روا عجاز چو معجزہ دیدہ می آید" لوگوں نے اس رائے کو قاآنی پرستی پر محمول کیا۔ گیارہ برس کے بعد آج پھر نوبت اس گفتگو کی آئی مگر رائے میں کوئی تفاوت نہیں ہوا ہاں! بعض خصوصیات اور نظر میں آ گئے جو اس وقت تک

سارا مرثیہ اسی طرز میں ہے جسے محاکات کی سچی تصویر کہنا چاہیئے۔ سارا واقعہ نظروں میں پھر جاتا ہے اور دل بیچین ہوتا ہے۔ انصاف سے کہنا کہ محض صنعت سوال وجواب کے التزام کے لئے یہ رنگ اختیار کیا ہے یا ایک کارنامہ پیش کیا ہے۔

افسر قاچار

افسر قاچار شہزادہ محمد رضا میرزا ابن خاقان فتحعلی شاہ ۱۲۱۱ھ میں طہران میں پیدا ہوئے۔ ارباب فضل ومعرفت کی صحبت کا یہ اثر تھا کہ باوجود حاکم گیلان وغیرہ ہونے کے علوم وفنون کی طرف ہمیشہ توجہ رہی۔ غزلیں نہایت پاکیزہ اور صاف ہوتی ہیں اور طبیعت شوخ وجدّت پسند ہے۔ چند منتخب اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

زہول روز قیامت بود چہ باک آنرا | کہ صبح کردہ بہ اندوہ شام ہجران را

آنچہ در وصف نگنجد صفت مشتاقیست | رفت زاندازہ سخن باز حکایت باقیست
ترسم آخر زکف از بیم فراقت نرود | نیمجانے کہ بامید وصالت باقیست

تا عکس ساقی آئنہ افروز جام شد | جز بادہ ہرچہ بود بہ عالم حرام شد
گر مرغ دل بزلف تو زاری کند مرنج | آرے فغاں کنند غریباں چو شام شد

طفلے نزند سنگ بدیوانہ دریں شہر | عاقل بچہ امید کند خانہ دریں شہر
زافسانۂ عشق من شوریدہ سر افسر | افسانۂ مجنوں شدہ افسانہ دریں شہر

آں یار کہ در کون ومکاں میطلبیدیم | چوں گنج بویرانۂ دل بود چو دیدیم
شد بستہ بہ پر بند چو از پائے کشودیم | بنشست بدل تیر چو از سینہ کشیدیم

تصانیف میں خاص طور سے قابل قدر ہے۔ قصائد و غزلیات کا ایک دیوان بھی چھوڑا ہے جن کا اقتباس بخوف طول ترک کیا جاتا ہے۔

بمآن علی کرمانی

راجی کرمانی۔ بمآن نام۔ اصلاً مذہب زرتشت کے پیرو تھے مسلمان ہوئے تو بمآن علی نام رکھا گیا۔ علما و عرفائے کرمان سے نہایت ارتباط تھا شہزادہ شجاع السلطنۃ غلام جب حاکم کرمان ہوئے تو ان پر بہت عنایت کی۔ ایک مثنوی شاہنامہ کے طرز پر نظم کی اور امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام کے غزوات کے حالات بیان کئے (جس طرح ملا رفیع باذل نے حملۂ حیدری لکھی ہے)[1]۔ یہ کتاب ظہیر الدولہ ابراہیم خاں کو نذر دی ہے۔ انداز طبیعت ابتدائی اشعار سے معلوم ہو جائیگا:۔

بنام خداوند دانائے فرد	کہ از خاک آدم پدیدار کرد
یکے را بقدرت ز خاک آفرید	یکے شد ز تابندہ آتش پدید
یکے سجدہ ناکردہ مسجود شد	یکے سجدہ ناکردہ مردود شد
زہے حال فرخندہ این مشت خاک	کزو شد عیاں نور یزدان پاک
ندانم چہ در جام ما ریختند	چہ صافے اندرین درد آمیختند
بدہ ساقی آن آتش تابناک	کہ تا کنش پیدا آمد از آب خاک
نہ از خاک تنہا ہمی ناک خاست	خم و ساغر و مے ہم از خاک خاست
ولے کو خواب از مئے ناب نیست	مگو ول کہ غیر از گل و آب نیست

کلام میں پختگی اور صفائی بیحد ہے۔ واقعات کے بیان کرنے کا سلیقہ بھی اچھا ہے بلکہ جوش اعتقاد بعض مقام پر خاص قوت پیدا کر دیتا ہے۔ مثلاً جنگ بدر میں

---

[1] اس وقت انکے متعلق لکھنا دشوار ہے کیونکہ نہ حملۂ حیدری موجود ہے نہ کوئی اور کتاب جس سے مدد لیجائے۔

سے لیکے امام زین العابدین علیہ السلام تک کے حالات شرح و بسط سے لکھتے ہیں۔ زبان نہایت صاف اور شیریں ہے اور طرز ادا نہایت دلکش۔ تکلّفات و تصنّعات یکقلم ترک ہیں تنہا رسول مقبول صلعم کے حال میں تقریباً نو سو صفحے تحریر کئے ہیں۔ دوسرا حصہ اس تاریخ کا قاچاریوں کے حال میں ہے یہ بھی نہایت ضخیم ہے۔ علاوہ بریں ایک مبسوط کتاب براہین العجم تحریر کی ہے جس میں فن شعر کے متعلق لطیف تحقیقیں درج کی ہیں۔ تذکرۂ شعرا و علما بھی انھیں کے قلم سے نکلا ہے۔ غرض دورۂ حاضرہ کے مصنّفین میں ان سے زیادہ امتیاز کے لوگ شاید نہ ملیں گے۔

حاجی مرزا آقاسی نے ایک مطلع اور حسنِ مطلع کہا۔ (مجمع الفصحا) :-

ساقی بدہ رطلِ گران زان مے کہ دہقان پرورد
اندہ برد، غم بشکرد، شادی دہد، جان پرورد

در خُم دلِ پیرِ مغان در جام مہر زرفشان
در دست ساقی قوتِ جان رخسار جانان پرورد

سپہر نے یہ قصیدہ محمد شاہ قاچار کی تعریف میں پورا کیا[1] چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:-

ساقی بہ رخ گلبرگِ تر، عکسِ رخش در جامِ زر
چوں پورِ آزر ناگذر، ز آزر گلستان پرورد
(ابراہیمؑ — آتش)

شراب مانگتا ہے :-

ہم راوقِ بیجادہ کن[2]، ہم بید برگ آمادہ کن
با خویش کارِ یادہ کن زان مہ کہ کتّان[3] پرورد

---

[1] قاآنی نے بھی اسکا تتمہ نظم کیا ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔

[2] یعنے انگور کو نچوڑ اور بید کی پتّیاں شراب صاف کرنے کے لئے مہیا کر۔

[3] کتان ایک کپڑا ہے جو چاند کے عکس سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

بانکہتِ عبیر بود شاخِ مشک بید — زیں زیں غلط کہ غیرتِ مشک تتار گشت
از دولتِ بہار جوان گشت روزگار — زیں زیں ز بختِ خواجہ جوان روزگار گشت

آن خواجۂ ستودہ کہ دوران غلامِ اوست
دورِ سپہر و گردشِ اختر بکامِ اوست

وفائی تفرشی

میرزا عبد اللہ خاں وفائی تفرشی بھی اسی زمانے کا خوشگوار شاعر ہے۔ شہزادہ ظل السلطان (پسر ناصر الدین شاہ قاچار) اور شیخ علی میرزا کا ندیم رہا ہے۔ طبیعت میں تغزل کافی موجود ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

نگویم جائے می شادی فروشد میفروش امّا — بسی ناشاد دیدم کز درِ او شادمی آید

ہر دیدہ کہ بینم نگراں است بروبیت — یک عمر براں دیدہ بحسرت نگرانم

یک رہ از طرۂ او شانہ نیامد بیروں — کز او صد دلِ دیوانہ نیامد بیروں
رفت بر باد ندانم ز چہ خاکسترِ شمع — نالۂ از دلِ پروانہ نیامد بیروں

رضا قلی ہدایت

ہدایت طبرستانی۔ رضا قلی خاں بن محمد ہادی ۱۵ محرم ۱۲۱۵ھ کو طہران میں پیدا ہوئے۔ بعد تکمیلِ علومِ رسمیہ اپنے باپ دادا کی طرح امرا و سلاطین کے دربار تک رسائی ہوئی اور شاہزادہ فرما نفرما اور شہزادہ شجاع السلطنۃ کی عنایت ان کے حال پر بہت رہی۔ شعر گوئی کا شوق جوانی سے تھا۔ ابتدا میں چاکر تخلص کرتے تھے۔ بعد کو ہدایت تخلص اختیار کیا۔ فتحعلی شاہ نے انھیں پہلے خان کا خطاب دیا پھر ملک الشعرا صبائے شیرازی کے بعد انھیں ملک الشعرا کا خطاب و منصب عطا کیا مگر یہ شدید بیمار ہو گئے اور حاضرِ دربار نہ رہ سکے۔ محمد شاہ کے زمانے میں نواب فیروز میرزا کے

بہر ذرہ ز نورِ آفتابش ظہورِ حق و ظہورش خود حجابش
ظہورِ جملہ ہستیہا بنورش خفائے ذاتش از فرطِ ظہورش
ہمہ کارے عجائب در عجائب بہر جا حاضر و از جملہ غائب

ناصر الدین شاہ

ناصر الدین شاہ قاچار کا ایک مجموعۂ غزلیات ہے اور تین جلدوں میں سفرنامہ۔ اس کتاب کی عبارت سہل ممتنع ہے اور جدید فارسی کا ایک معتبر سرمایہ۔ جس قدر الفاظ غیر زبانوں کے رائج ہیں اُن کی ابتدا اسی سفرنامہ سے ہے۔ بلادیوروپ و امریکا کے الفاظ فرانسیسی تلفظ کے ساتھ بکثرت استعمال کئے ہیں کیونکہ دوسرا تلفظ فارسی میں کھپ نہیں سکتا تھا اور فارسی زبان خود بھی اپنی شیرینیِ ادا اور قبولِ عام کی وجہ سے ایشیا کی فرانسیسی کہلاتی ہے) بعض اصطلاحی ناموں کے فارسی میں ترجمے کر لئے ہیں جو نہایت شیریں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نثر نویسی بالکل نرالی ہے۔ جو بولتے ہیں وہی لکھتے ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ انشا پردازی کے لئے قلم اٹھایا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"دیشب کہ دریا را تماشا کردیم، بعضے ماہیہائے ریزہ دیدیم مثلِ حیوانات کوچک **فسفر** دار، کہ در مازندرانِ ایران بسیار ست و در شب دمِ شان برق میزند۔ این ماہیہا ہم توے دریا از زیر موج و کفِ آب کہ از زیرِ چرخِ کشتی بیرون می آمد زیر و بالا میشدند و مثل **الکتریسیتہ** در تاریکیِ شب برق می دادند۔ خیلے تماشا داشت۔ ہنوز نرسیدہ مقابلِ رود خانۂ **طیمس**، سہ کشتی زرہ پوشِ **انگلیس** باستقبالِ ما آمدہ بنا کردند بہ شلیکِ توپ نمودن و سلام دادن۔ کشتیہائے بخاری و بادبانی زیاد ہم کہ ہمہ پُر از مرد و زن بود از انگلیس برائے تماشا آمدہ بودند۔ متصل

مظفر الدین شاہ

مظفر الدین شاہ قاچار نے بھی یوروپ کے سفر کئے تھے اور دو جلدیں سفرنامہ کی ناصر الدین شاہ کے انداز پر لکھی ہیں۔

خاتمہ

اب فارسی لٹریچر کی یہ حالت ہے کہ سلاست ادا اور صفائے بیان کیطرف مائل ہے۔ خصوصاً جمہوریت و مشروطیت کی ہوانے یوروپ کے علوم وفنون کو بھی ایرانی لباس پہنا دیا ہے۔ اخبار اور جرائد بھی بالکل مذاق حال کے موافق نکل رہے ہیں۔ علوم وفنون کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ ناول اور ڈرامے نے بھی سرزمینِ ایران پر دخل کیا ہے۔ یوروپ کے افسانوں کے ترجمے ہوتے چلے جاتے ہیں اور زبان ایک خاص رنگ اختیار کرتی جاتی ہے۔ غیر زبانوں کے الفاظ و خیالات بھی شامل ہو رہے ہیں۔ نمونہ کے لئے ایک عبارت سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ سے نقل کی جاتی ہے:۔

"اصناف کسبہ ہم در قیل و قال پول سیاہ۔ امروز ہفتاد شاہی یک قران۔ فردا ہشتاد شاہی۔ فقرا ہم در تدارک نان۔ امروز یکمن دو قران فردا سہ قران۔ ہیچ کس را پروائے وطن واز حب او اثرے در ظاہر و باطن نیست۔ ہمگی ناقص العقل و قاصر الایمان۔ مردہ اند ولے زندہ۔ زندہ اند ولے مردہ"۔

ایک ڈراما کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

گلچہرہ ۔ آغا باجی! چرا گریہ میکنی؟

شرف النساء خانم ۔ (دست اورا گرفتہ تکان دادہ) گم شو!

گلچہرہ ۔ (باز شیطانی کردہ دست بطرف او دراز می کند) آغا باجی آغا باجی! ترا بخدا! چرا گریہ میکنی؟

شرف النساء خانم ۔ (باز نیز دستش زدہ) گفتم گم شو دیدہ!